ایک کھویا ہوا لمحہ

عفّت موہانی

ایک
کھویا ہوا لمحہ...

عفّت موہانی

EK KHOYA HUA LAMHA
by IFFAT MOHANI
Ed. 1993 PRICE RS. 45/-

قیمت

پینتالیس روپے

ناشر :- نسیم بکڈپو ۲۵- گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ ۱۸
مطبع :- نظامی آفسیٹ پریس لکھنؤ

حسن و جمال کے مجسمے، مہر و وفا کے پیکر

اقلیم ادب و شعر کے

تاجدار

جناب عبدالعزیز خالدؔ

کے نام

بصد عجز و محبّت

جو

کتاب خواں بھی ہے وہ صاحب کتاب بھی ہے!

ناچیز عفت موہانی

خالدؔ! لب گویا ہے نہ گوش شنوا   بے نور ہوئی روشنیٔ شہر نوا
انبوہ خلائق میں ہے گم صم شاعر   دل خستہ جگر سوختہ تنہا تنہا!

بڑے وسیع و عریض باغ کے درمیان ایستادہ وہ نیلی کوٹھی بہت شاندار اور خوشنما تھی۔ اونچا سا جالی دار گیٹ تھا۔ اُدھر سے گذرتے ہوئے راہگیر غیرارادی طور پر ایک نظر گیٹ کے اندر ضرور ڈال لیتے تھے۔ اور ایک شبیہ سا دل میں لیے آگے بڑھ جاتے تھے۔ پھاٹک سے لے کر اونچے برج تک ہمیشہ سناٹا چھایا رہتا۔ کبھی کبھار اتفاق ہی سے ایک کمر خمیدہ باغبان اُوپر کے بدن سے برہنہ کمر سے ایک تہبند لپیٹے... درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ کے درمیان اول جلول سا کام کرتا نظر آتا تھا ویسے اس جگہ کے درختوں پر خدا کا کچھ ایسا کرم تھا کہ وہ سال کے بارہوں مہینے سدا بہار رہتے پھلدار گھنے گھنے درختوں کو تو آبیاری کی ضرورت ہی نہ تھی وہ ہمیشہ کچے پکے پھلوں سے لدے رہتے۔ ان کا نگراں کوئی نہ ہوتا! اور آس پاس کے لڑکے لڑکیاں بے روک ٹوک گیٹ کی جالی پر پاؤں ٹیک کے اندر کود جاتے اور جتنے جی چاہتا پھل کھاتے کچھ پھینکتے کچھ گھر لے جاتے۔ کبھی پرلی طرف صحن کے حوض میں نہایا کرتے۔ لڑکیاں آتیں تو باغ کے سارے مہکتے ہوئے پھول آنچلوں میں بھر لے جاتیں!۔

اندرونی گھر میں ایک سن رسیدہ عورت کام کاج کرتی دکھائی دیتی۔ عورت چہرے سے مخلص اور ایماندار معلوم ہوتی تھی! اور بے حد فرمانبردار تھی! باہر ایک مرد اور کوٹھی کے اندر ایک سال خوردہ عورت کے سوا اس لق ودق کوٹھی میں اگر کوئی تیسرا وجود تھا تو ایک درمیانی عمر کی خاتون کا تھا۔ اکثر پاس پڑوس کی خواتین نے انھیں پچھلے باغ کے ایک جھنڈ کے درمیان پتھر پر بیٹھے دیکھا تھا کسی گہری سوچ میں غرق، کسی بلیغ فکر میں گم۔ نہ وہ کسی سے ملنا جلنا پسند کرتی تھیں نہ ان کے پاس کوئی آتا جاتا تھا۔ ہمسایوں میں وہ ایک پراسرار شخصیت تھیں۔ ان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوئیں۔

لوگوں کو ان کے حالات جاننے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن ہمت کسی کی نہیں پڑتی تھی کہ اس قفل ابجد کو کسی ترکیب سے کھولنے پر مجبور کریں۔! پہلے پہل دو تین عورتوں نے ان سے میل جول بڑھا کر ان کی تنہائی، پراسرار شخصیت، اور گہری فکروں کا راز جاننے کی کوشش کی تھی لیکن جب انھوں نے ان کے سوالات کے بہت اکھڑے اکھڑے جواب دیئے تو وہ بددل ہو گئیں، اور دوسروں سے ان کی کم دماغی کھردرے سلوک کا ایسا پروپیگنڈہ کیا کہ پھر کسی نے ادھر کا رخ نہ کیا اور لوگوں کا تجسس بالآخر پھیکا پڑ گیا! لیکن وہ اونچی خوشنما کوٹھی، اس کے پراسرار مکین دوسروں کے لیے دلچسپی کا سامان ضرور تھیں! اگر عورتیں پرلی طرف کے باغ کے سامنے سے گذرتی تھیں تو ان خاتون کو دیکھ کر ٹھٹھک ضرور جاتی تھیں۔ جو شاید چالیس بیالیس سال کی عمر میں بھی بہت پرکشش اور جاذب نظر تھیں۔ ان کا رنگ روپ کندنی تھا۔ جسم سڈول بال سیاہ چمکدار کمر سے نیچے جھومتے ہوئے، اداس آنکھیں، پہلو سے انجانا سا غم آشکار، پر مطلب جوان کبھی کہانیاں کہتے جھجکتے تھے۔

•

کون تھیں یہ خاتون، کیا تھا ان کا غم، کیا تھا ان کی تنہائی کا راز۔ اور کیا تھا ان کا دکھ جسے ماہ و سال نے بھی معدوم و موہوم سی مسرت سے نہ بدلا تھا۔!

بے نوا ہوں، کسی چیز کا محتاج نہیں، مرا حاصل ولا حاصل نظر نے خوش گر رہے
ناجیہ کی پرانی عادت تھی۔ جب بھی جج صاحب کا کہیں تبادلہ ہوتا اور وہ کسی نئی کوٹھی میں مقیم ہوتے، بس ناجیہ کو اپنے پڑوسیوں سے میل جول کی فکر لگ جاتی۔ اب تین مہینے پہلے جج صاحب کا پھر تبادلہ ہو گیا تھا اور وہ کسی ضلع سے شہر آ گئے تھے۔ امید تو یہ تھی کہ اب کی انھیں مستقل طور پر یہیں رہنا تھا۔ چنانچہ جج صاحب نے ایک بڑی عمدہ کوٹھی خرید لی۔ وہ ناجیہ کو تو پسند ہی تھی لیکن جج صاحب کی بیگم اور ان کی بڑی لڑکی عذرا کو بھی بہت اچھی لگی۔ ناجیہ تو خیر سترہ اٹھارہ سال کی ایک ناسمجھ اور لا اُبالی سی لڑکی تھی۔ انٹرنس کر چکی تھی اور خود کو کسی عالم فاضل علامہ سے کم سمجھنے پر کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ اسے معمولی سے معمولی چیز میں بھی حسن کا کوئی پہلو نظر آ جاتا تھا۔ اور وہ اس نکتے کے بارے میں دیر تک سوچتی رہتی تھی۔ اس کو حسن پرستی، جذباتیت، اور حساس عادت سے بیگم اور عذرا بڑی نالاں تھیں۔ ایک دفعہ اسے ملازمہ کے بچے کی آنکھیں بہت اچھی لگی تھیں، چنانچہ ماں سے ضد کر کے اس نے کو آؤٹ ہاؤز کا ایک کمرہ دلا دیا تھا تاکہ اس کے بچے کی خوبصورت آنکھیں روز دیکھ سکے!۔ اتفاقاً دو سال کا وہ ننھا کھیلتا بچہ خسرہ میں مبتلا ہو کر دو تین دن کے اندر اندر چل بسا۔ تب تو ناجیہ کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے پاگل ہو گئی تھی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ پڑھنے لکھنے سے جی اُچاٹ ہو گیا تھا۔ چھ سات مہینے تک وہ پرائے بچے کے غم میں آنسو بہاتی رہی تھی۔ جبکہ ملازمہ نے اسے صبر کر لیا تھا۔ اس کے چھ سات بچے اور تھے۔ جو دن

بھر لڑتے جھگڑتے اور ماں کا ناطقہ بند رکھتے تھے۔ ایک بچے کی کمی اسے محسوس تو ہوئی تھی مگر اتنی بھی نہیں جتنی ناجیہ کو ہوئی تھی۔ اس کی عجیب و غریب عادتیں اس کی بڑی بہن اور ماں باپ کے لیے پریشان کن تھیں۔ وہ اسے سمجھاتے تھے۔ خود کو بے حس اور بے پروا بنانے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ بھلا باسی پھولوں کی باسی مہک کون سے رومان انگیز جہانوں کی سیر کرا سکتی ہے۔ گھاس پر چمکتے ہوئے شبنم کے موتی سب کو اچھے لگتے ہیں مگر خود کو بھول کر ان کی دید میں گم ہو جانا اگر پاگل پن نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کسی بوڑھے اور غریب شخص کو دھجیاں لگائے سسکتے سسکتے سڑک پر چلتے دیکھ کر سب ہی کو رحم آتا ہے۔ لیکن کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جانے پوچھے بغیر ایک بڈھے کو گھر لے آئیں اسے مانگے بغیر صاف ستھرے کپڑے پہنائیں اور دس پندرہ روپے اس کے ہاتھ میں دیکر اسے دور تک سڑک پر پہونچا آئیں۔ لیکن ناجیہ ایسا کرتی تھیں اور باپ کی ڈانٹ اور ماں کی بری بھلی سنتی تھی۔ بڑی بہن تو اسے ابھی سے پاگل، سنکی اور نیم دیوانی سمجھتی تھی۔ وہ خود بیس بائیس سال کی خوبصورت ذی شعور اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اسی سال اس نے ایم۔ اے کیا تھا اور اب کچھ آرام کر کے ریسرچ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ سال بھر قبل اس کی منگنی اس کے چچازاد بھائی عفان سے ہو چکی تھی۔ اور وہ ان دنوں جرمنی میں تھے۔ اور دماغی امراض سے متعلق تحقیق کر رہے تھے۔ عذرا کا سنہرا مستقبل محفوظ تھا لیکن جج صاحب اور ان کی بیگم سلمیٰ کو ناجیہ کی اتنی فکر تھی کہ صحیح معنوں میں ان کا خواب و خور حرام تھا۔ وہ لوگ ناجیہ کے شعور، عادت اور فطرت کی گہرائی تک نہیں پہونچتے تھے۔ اور نہ یہ سوچتے تھے کہ اگر وہ اس قسم کی سنکی اور عجیب سی تھی تو اس میں کوئی جینئس تو پوشیدہ نہ تھا۔ وہ عام فطرت والے کے

کیوں نہیں پیدا ہوئی تھی ۔ اور یہ بات بھی تو تھی کہ جیسے جیسے اس پر لعن طعن زیادہ ہو رہا تھا، اسے سنکی، دیوانی اور خبطی کے سے خطابات مل رہے تھے ۔ وہ مارے ضد کے اور بھی خبطی بنتی جا رہی تھی ۔ اب تو جان بوجھ کے ایسی حرکتیں کرتی کہ ماں باپ اور بہن بھائی جھلا اٹھیں اور خفا ہوں ۔ رفتہ رفتہ اسے اپنی حرکتوں اور سب کی خفگی میں لطف آنے لگا۔

ایک دن صبح صبح جبکہ وہ بلی کے صحت مند بچے کو خوشبودار صابن سے نہلا کے زبردستی اس کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی تھی اور کنکھیوں سے سب کی طرف دیکھتی بھی جا رہی تھی بیگم سلمیٰ نے چپکے سے جج صاحب سے کہا

"میرا کہا آپ نہیں مانتے، دیکھیے پچھتایئے گا۔"

چونک کر جج صاحب نے کہا "کیا نہیں مانا تمہارا کہا۔ کیا دنیا نہیں مجھے کیا کہا تھا تم نے؟"

"کئی بار کہہ چکی ہوں کہ شہر کے کسی اچھے ماہر نفسیات کا پتہ چلایئے اور دکھایئے اس سودائی لڑکی کو، وہ علاج کرے کچھ، اس کا دماغ ٹھکانے پر آئے۔ کیا حشر ہوگا اس کا۔ آخر ایک دن اسے بھی پرائے گھر جانا ہے۔ وہاں بھی اگر یہی بدحواسی اس پر طاری رہی تو کوئی اسے برداشت نہیں کرے گا۔ پہنچ جائے گا آپ کا داماد اسے آپ ہی کے کلیجے پر۔ اس کی حرکتوں کو بچپنا کہہ کے مت ٹالیے۔ دیکھیے ذرا اس کی طرف کیا کر رہی ہے!"

جج صاحب جو کافی پی رہے تھے پیالی میز پر رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر انھیں بھی ذرا پریشان اور فکر مند ہونا پڑا کہ اب بلی کے بچے کو کاجل لگا دینے کے بعد ناجیہ نے اس کی کاجل زدہ آنکھوں کے نیچے سرخ رنگ کی افشاں بھی لگائی تھی۔ اور جب بچہ اپنی گت بنوا کے مریل انداز سے کرسی کے نیچے جانے لگا تب ناجیہ ہنستے ہنستے

بھدے فرش پر بیٹھ گئی۔ جج صاحب کو تو پریشانی تھی ہی۔ مگر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکے
بیگم سلمیٰ اور زیادہ بگڑ بیں اور لے آواز دے کر یاس بلایا۔
"بولیے" پاس آکر اس نے انھیں لٹھ سا رسید کیا۔
"کیا کر رہی تھیں یہ" غصے سے انہوں نے پوچھا
"کیا آپ نے دیکھا نہیں؟"
سن لیا آپ نے اس زبان دراز کا جواب۔ سخت برہم ہو کر انہوں نے جج صاحب کو مخاطب کیا۔
"تمہاری یہ حرکتیں اچھی نہیں ہیں۔ بیٹی" جج صاحب نے ملائمت اور نرمی سے سمجھایا
ماشاءاللہ تم کالج میں پڑھتی ہو، سمجھدار ہو، تمہاری عمر لگ بھگ سترہ سال ہے۔ اب تمہیں
سنجیدگی متانت اور کیا کہتے ہیں کہ بردباری اور۔ اور تہذیب سیکھنی چاہیے، کوئی اگر دیکھ لیتا
کہ تم نے بلی کے بچے کو نہلایا ہے اس کے کاجل تھوپا ہے اور منہ پر افشاں ہے تو تم ہی بتاؤ
وہ تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کرتا۔"
وہ کون۔ ڈیڈی۔؟" ناجیہ نے معصومیت سے پوچھا کس کے متعلق کہہ رہے ہیں آپ؟
"جو بھی تمہیں ایسا فضول کام کرتے دیکھتا!"
وہ تو میرا ممنون و مشکور ہوتا۔ ام سوری۔ ممنون و مشکور ہوتا کہ میں نے گرمی کی اس صبح کو ایک
بے زبان کو نہلا دھلا کے تر و تازہ کر دیا۔" ناجیہ نے جواب دیا" اور سنگھار کا شوق تو لیڈیز کو ہوتا
ہی ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ وہ بچہ بلی ہے۔ اور کاجل اور افشاں اس کا پیدائشی حق ہے!
"شیطان کی صورت دیکھ کر غصہ آ رہا ہے۔ میں کہاں اس چڑیل سے ماتھا پھوڑ دوں گی"
سخت غیض و غضب کی حالت میں بیگم صاحبہ اٹھ کر چلی گئیں۔

کیا شیطان اور چڑیل آپ کی صاحبزادیاں ہیں۔ ڈیڈی۔ اکلوتی بیٹی ناجیہ نے پوچھا۔
میں کیوں ہونے لگی۔ تنک کر عذرا بولی۔
ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں تمہاری والدہ" بڑی رعونت سے جج صاحب نے کہا "علاج کروائے بغیر اب کام نہیں چلے گا!۔
"کس کا علاج۔ ڈیڈی۔" ناجیہ نے پوچھا۔
"تمہارا۔ تم آہستہ آہستہ پاگل ہوتی جا رہی ہو۔" عذرا نے کچھ چیخ کر کہا۔
"آہستہ باجی آہستہ" ناجیہ بولی" اگر والد صاحب سامنے بیٹھے ہوں تو اس طرح چیخ کے نہیں بولتے۔ آپ کو خیر معلوم ہی ہوگا۔ اتنی دور تک پڑھا لکھا ہے آپ نے" آخر"۔
جج صاحب جو بیزار ہو گئے تھے۔ اٹھ کر چلے گئے۔ کوئی سی تعطیل کا دن تھا۔ کمرے کے اندر سے بیگم صاحبہ نے عذرا کو آواز دی۔
"آکے ذرا سامان رکھوا لو۔ کب سے بکھرا پڑا ہے۔" عذرا نے ایک تیز نگاہ ناجیہ پر ڈالی اور اٹھ کر چلی گئی۔
صحن میں رکھے گملوں کو باغبان سینچ گیا تھا۔ دو بڑے گملوں کے درمیان زمین ٹھنڈی اور نم تھی۔ کوئی تصویر دار رسالہ لے کے ناجیہ گملوں کے بیچ جا بیٹھی۔ نظریں رسالے پر تھیں اور کان لگے تھے ماں اور بڑی بہن کی تیز تیز آوازوں پر۔ وہ اسی کے ملفوظات بیان کر رہی تھیں۔
ناجیہ کے لبوں پر شریری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اکوئی کچھ کہے۔ مگر وہ تو اپنی دانست میں نہ پاگل تھی نہ خبطی۔ وہ تو الٹا اپنے ماں باپ اور بہن ہی کو عقل سے کمزور سمجھتی تھی۔ جو کسی کے محسوسات اور جذبات اور ضروریات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ پھر اسے دفعتہً

اپنا کلاس فیلو بھولا بھالا سالار کا رفیع یاد آیا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ حد سے زیادہ بدھو اور احمق سا تھا۔ اس کی ہر شرارت برداشت کر لیتا تھا۔ وہ اسے بناتی تھی اور وہ بن جاتا تھا۔ اگر وہ اس کی درگت بنا ہنستی تو وہ چپ چاپ اس کی صورت تکا کرتا۔ اور ایسے بدھو لڑکے جو سر سے پاؤں تک حماقت مجسم ہوں۔ ناجیہ کو بہت پسند تھے۔ جس انداز سے اٹھاؤ بیٹھاؤ اٹھ بیٹھ جاتے ہیں من مانی نہیں کرتے حکم نہیں چلاتے۔ مرد ہونے کا احساس نہیں جتلاتے۔ جبکہ سچ تو یہ تھا کہ اس کچی عمر ہی سے ناجیہ کو مرد قطعی اچھے نہیں لگتے تھے۔ نہ باپ نہ چچا نہ ماموں۔ وہ تو ہزار ہزار خدا کا احسان مانتی کہ اس کا کوئی بڑا چھوٹا بھائی نہ تھا۔ جو اس منھی سی پرسکون زندگی میں اپنی مردانگی اور برتری کا زہر گھولتا۔ اسے تیز طرار نشین پرست اور ترقی کے نام پر تنزل کی طرف رواں دواں خواتین اور نہایت چلبلی، بوٹوں کو ٹیڑھا ترچھا کر کے الٹی سیدھی انگریزی بولنے والی لڑکیاں بھی ناپسند تھیں۔ ان کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ اسے تو نہایت مظلوم، معصوم، بے زبان اور الم پسند عورتیں اور لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ جن کی رنجیدہ آنکھیں اسے بھیگی بھیگی لگتیں ان پر وہ اپنی ایک ننھی سی جان کو ہزار کرکے چھڑکنے کو بھی تیار رہتی تھی۔ اور چونکہ عورت کی مظلومیت غموں اور بے کسی کے آنسوؤں کا سارا تعلق مردوں کی بربریت، حکومت پسندی اور تیز مزاجی کے ساتھ ساتھ بے حسی اور بے وفائی سے بھی تھا۔ لہذا دنیا کے سارے اچھے برے مردوں پر وہ دن رات کے ہزاروں لمحوں میں لعنت ملامت بھیجتی رہتی تھی۔! مگر مظلوم و مغموم عورتوں میں اس کی اعلیٰ تعلیم یافتہ امی اور اونچے درجے میں پڑھنے والی باجی شامل نہ تھیں۔ چنانچہ اسے ان دو حکومت پسند مغرور و متکبر اور اپنی ذات میں مست خواتین سے نہ محبت تھی نہ دلچسپی۔ عجیب سی فطرت لے کے آئی تھی۔! اور سب کو اپنی واہیات

"آپ شاید اپنی شکل میرے ڈوپٹے پر دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں ۔"

اور لڑکا ادھر اُدھر دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا ۔

ڈوپٹے کا دردناک حشر دیکھ کر عذرا نے سر پیٹ لیا تھا ۔ اور تبھی سے ناراض تھیں ۔ ڈوپٹہ کا گولا بنا کر انھوں نے سر پر پھینک مارا تھا اور دیر تک برا بھلا کہتی رہی تھیں ۔ اس نے ڈوپٹہ لیا تھا اور ڈیڈی کے لاڈلے کتے لوائن کے سر پر بڑا سا پگڑ باندھ کے گیٹ پر لا بٹھایا تھا ۔ ہنستے ہنستے راہگیروں کا برا حال ہو رہا تھا اور چوکیدار گورکھا تو مارے ہنسی کے گر گر پڑا ۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ لوائن جیسے فرمانبردار اور سعادتمند کتے نے ذرا بھی سر ہلا کے پگڑ گرانے کی کوشش نہیں کی تھی ۔

ویسے ناجیہ نے اسے وارننگ بھی دی تھی ۔

"اگر سر سے ذرا گرایا تو دیکھنا اپنا حشر ۔ ایٹوڈیٹ گھرانے کے کتے ہو تم میاں ۔ بزرگوں کے سامنے ادب سے سر جھکا کے رہنے کی عادت ڈالو ۔"

نہ جانے وہ کب تک کی طرح گملوں کے بیچ بیٹھی خود بخود مسکرایا کرتی ' اسے بیگم صاحبہ نے توجہ دلائی ۔

"تمہیں کالج نہیں جانا ہے ۔ آخر کیا کر رہی ہو ۔ وہاں بیٹھی ہوئی ؟ عذرا تو چلی بھی گئیں ۔"

"کسی کی تقلید مجھے پسند نہیں امی ۔ میں اپنے وقت پر جاؤں گی ۔"

اٹھو تو وہاں سے !۔

وہ کاہوں کے انداز سے اٹھ گئی ۔ اور ہمیشہ کی طرح وسیع و عریض صحن سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں اس لمبی چوڑی اور اونچی دیوار کی طرف اٹھ گئیں جو آدھی دیوار چین کی طرح اس کی کوٹھی کے پیچھے ایستادہ تھی ! بجانے کون سے پرانے وقتوں کی حویلی ہوگی ۔ ورنہ آج کل جو کا یک منا گھر

نتے ہیں، جنہیں کمپلکس کا مرعوب کن نام دیا گیا ہے اس میں ایسی دیوار کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔
مگر یہ دیوار اسی دن سے اس کے لیے دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گئی تھی جس دن وہ اپنی ذاتی کوٹھی
میں منتقل ہوئے تھے! اس نے اپنے برآمدے سے اُدھر جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ دیوار کے پیچھے
تو دیکھنا ممکن نہ تھا مگر ادھر اُدھر اسے سرسبز درخت، کچھ دو رنگ جنگلی پھولوں کے گملے اور ایک
گنجان درخت امرود کا ضرور دکھائی دیا تھا، جو خام پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ ایک دن ایک خاصی معمر
اور حد درجہ موٹی تازی عورت دکھائی دی تھی جو امرود تلے بیٹھی گیہوں صاف کر رہی تھی۔

او۔ موٹی نانی۔ ناجیہ نے اسے ایسی آواز دی تھی جو وہ سن نہ سکے اور اس نے سنی بھی نہیں۔
اچانک اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اس عظیم الشان حویلی کی مالکن ایسی وا ہیات نہیں ہو سکتی۔ اس نے خود
سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ یہاں کی بہت قدیم خادمہ ہو گی جیسی اس کے گھر میں بھی دادی بی تھیں۔ وہ
بھی خیر سے بیجاپور کا گنبد اور سانچی کا توپ تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ وہ جج صاحب کی کھلائی تھی،
اور جج صاحب تک ان کا ایسا احترام کرتے تھے کہ گھر کے اہم معاملوں اور مسائل میں بھی ان سے
ضرور مشورہ لیتے تھے۔ اس کی دادی دادا تو جانے کب عالم آباد سدھار چکے تھے۔ اس نے اپنے
نانا نانی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اب ان دادی بی کے لیے ضرور گڑ گڑا کر اللہ میاں سے دعا مانگی
تھی کہ اگر اللہ میاں کو ضرورت ہو تو براہ کرم انھیں اپنے پاس بلا لیں۔ سب سے زیادہ اس کا بھیجہ
وہی کھاتی تھیں۔ اس کا چلنا پھرنا، پہننا اوڑھنا، ہنسنا بولنا اور کھانا پینا تک ان کی آنکھوں
میں کھٹکتا تھا۔ ہمیشہ اس پر غراتی تھیں۔

دھپ دھپ کر کے نہ چلا کرو۔ ابھی باپ کچہری سے آتا ہو گا۔ اے میں کہتی ہوں۔ یونہی
بے دوپٹے کے اس کے سامنے جا کھڑی ہو گی، تیل لگا کے چوٹی گوندھو۔ یہ دیوانوں کے سے

بال گردن اور کندھوں پر ڈالے گز گز بھر کے لگاتی پھرتی ہے لڑکی۔ الجھن نہیں ہوتی۔؟ بھری دوپہر میں باغ کی روشوں پر بائیسکل چلاتی ہو۔ خدا نہ کرے اگر کوئی سایہ سیٹ ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مگر میری سنتا کون ہے۔ اماں باوا ہی کانوں میں تیل ڈالے آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے ہوں تو میں خواہ مخواہ کیتا کی طرح بھوکوں۔ ارے ہزار دفعہ کہا کہ کھانا ایک طرف بیٹھ کے اور بسم اللہ پڑھ کے کھاتے ہیں۔ رکابی میں پالی سالن رانڈ کے آسمان تلے نہیں بیٹھتے۔

بہرحال ان دادی بی نے اسے زندگی سے عاجز کر رکھا تھا۔ عذرا کی ایسی نصیحتیں بہتیں کرتی تھیں اس پر جی جان سے واری جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ عنقریب سسرال جانے والی تھی۔ اس کے سسرال جانے میں ابھی پانچ چھ سال کی دیر تھی اور نادیہ چاہتی تھی کہ اللہ سے وہ بھی چلی جائے سسرال۔ اس جلے تن بڈھی سے تو نجات مل جائے۔

وہ لباس تبدیل کر کے تو بڑبڑانے لگی۔

جج صاحب کار لے گئے۔ بڑی صاحبزادی اپنی گاڑی میں چلی گئیں۔ جب سے کھلونے کی سی ماروتی کار خریدی ہے ان کے تو دماغ ہی آسمان پر چڑھ گئے ہیں۔ اب میں ایک فضول ذات ہوں جو کرائے کے رکشہ پر کالج جاؤں۔ ساری خلقت یہ دیکھتی ہے اور دانتوں میں انگلیاں دباتی ہے کہ یہ جو رکشے پر جا رہی ہیں جناب مصطفیٰ احمد جسٹس کی صاحبزادی ہیں۔ واہ۔ نہ عزت اور نہ شان کی کرکری نہیں ہوتی۔"

"کیا بکے جا رہی ہو۔" بیگم نے کہا۔ "ایک سال اور چلی جاؤ رکشہ پر۔ کہا تو ہے تمہارے بادا نے بی۔ اے میں جاؤ گی تو لے دیں گے تمہیں بھی گاڑی۔

"کیا لے دیں گے، کنجوس مکھی.........."

چپ زبان دراز۔" بیگم نے للکارا۔ باپ کو کہتی ہے کنجوس۔"

"ہاں وہ آپ کے شوہر ہیں آپ کو اچھے لگتے ہوں گے۔ مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

"بہت پٹیوں گی نا جبہ۔ کہے دیتی ہوں!"

رکشہ پہچان کا تھا، روز آتا جاتا تھا۔ اب بھی دیر سے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔

جلدی آجایا کیجئے صاحبزادی۔ میری اور سواریاں بھی تو ہیں، انھیں دیر ہو جاتی ہے۔"

اچھا اچھا۔ وہ کتابیں سیٹ پر پٹخ کر خود بھی بیٹھ گئی۔ اور باتیں شروع کر دیں۔ رکشہ چلا۔

کیا تم شروع سے رکشہ چلاتے ہو۔؟

ہاں۔ بی بی

دوسرا کام کیوں نہیں کرتے۔؟ دن بھر برسات گرمی سردی میں انسانوں کا بوجھ ڈھوتے پھرتے ہو۔!

کیا کروں بی بی۔ پڑھے لکھوں کو آج کل کوئی کام نہیں ملتا۔ مجھے کیا ملے گا۔ اب تو یہی غنیمت ہے کہ صبح سویرے سے نکلتا ہوں تو رات کے دس گیارہ بجے تک کچھ کما لیتا ہوں۔ گھر میں بڈھی ماں ہے۔ میری بیوی ہے۔ ایک بہن ہے۔ اس کی شادی کے لیے پریشان ہوں۔ چھ بچے ہیں۔ ساری کمائی پیٹوں ہی میں ہضم ہو جاتی ہے سرکار۔ کھاؤں کیا۔ بچاؤں کیا۔ بس زندگی دی ہے دینے والے نے۔ جی رہے ہیں، شکر ادا کر رہے ہیں۔"

"اچھا۔ نور خاں بہن کی شادی کے لیے کتنی رقم کی ضرورت پڑے گی۔"

بی بی۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ غریبوں ہی میں رشتہ طے کیا ہے پانچ ہزار میں سب کام ہو جائے گا۔ چھ مہینے سے منگنی ہوئی پڑی ہے آج پیسے ملیں تو آج اسے اٹھا دوں۔ بڑا

بوجھ ہوتا ہے بی بی۔ لڑکی کا۔!

تمہاری بھی لڑکیاں ہوں گی۔

ہیں بی بی۔ دو لڑکیاں ہیں۔ سب سے چھوٹی۔ ایک چار سال کی۔ ایک دو سال کی۔ احسان ہے مالک کا۔ پہلے چار مرد بچے دے دیئے۔ مگر ابھی وہ بھی کسی کام کے قابل نہیں۔ محلے کے مکتب میں پڑھنے بھیجتا ہوں کچھ تو الف بے آجائے۔ ورنہ گنوار گدھے رہیں گے تو ایک دن اسی طرح رکشہ ہاتھ میں آجائے گا! بڑا آسرا ہے ان کا بی بی۔

"کاہے کا آسرا۔"

ہوتا ہے بی بی۔ لڑکوں ہی سے تو ماں باپ کو سہارا ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکیوں میں یہی تو انتر ہے سرکار۔ بیٹی جوں جوں جوان ہوتی جاتی ہے۔ باپ بڈھا ہوتا جاتا ہے اور بیٹے جیسے جیسے جوان ہوتے ہیں باپ بھی جوان ہونے لگتا ہے۔!

ہاں۔ یہ تو ہے۔ کیا نام ہے تمہاری بہن کا۔!

ظاہرہ۔

کیا عمر ہے۔

پندرہ سال۔

اتنی سی عمر میں بیاہ دو گے اسے۔؟

ہاں بی بی۔ لڑکی جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا۔!

باتوں کے دوران ناجیہ کی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں بوسیدہ سا قمیص پہنے تھا جس پر کہ دنیا بھر دو سرے کپڑے کے پیوند چسپے ہوئے تھے۔ پرانا دھرنا پتلون تھا۔ جو استعمال ہوتے ہوتے گھس

چکا تھا۔ رکشے والا بھی زیادہ عمر کا نہ تھا۔ مگر لگاتار مشقت اور افلاس نے اسے چالیس سال میں ساٹھ سال کا عمر رسیدہ بنا دیا تھا۔ ناجیہ جو اپنے بنچر کی ایک ہی تھی ۔ اس کے دل میں رحم و مروّت کے جذبے جاگنے لگے ۔ ایک بار وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میاں تم نے شادی ہی کر کے یہ مفت کا عذاب کیوں لیا ہے کہ اب رکشہ کھینچ رہے ہو۔ پھر یہ سوچ کر منہ بند کر لیا کہ کبھی ایک دفعہ ارمان اٹھا ہو گا وہ اس کے ذاتی معاملے میں بولنے والی کون ۔

کالج پہونچ کر بھی اسے اسی کا خیال آتا رہا ۔ !

اس کا بدھو کلاس فیلو اسے گیٹ پر مل گیا ! وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا ۔ مگر وہ گھنی بنی رہی۔

ایک گھنٹہ مس ہو گیا ۔ آج دیر کر کے کیوں آئیں ۔ میں تو سمجھا تھا تم نہیں آؤ گی ۔

"اگر نہ آتی ۔"

تو میرا جی نہ لگتا ۔ میں بھی چلا جاتا ۔ !

ارے ۔ میاں ۔ تم یہاں پڑھنے آئے ہو ۔ سمجھے ۔ ایف اے کے طالب علم ایسے ڈائیلاگ نہیں بکتے ۔ یہ تو فارغ التحصیل لوگوں کے بولنے کے مکالمے ہیں ۔ وہ مربیانہ انداز میں بولی: "ایسی رومان زدہ باتوں کو آئندہ کے لیے بُک کر لو ۔ جب تمہارے ہونٹوں پر ابابیل کا گھونسلہ سج جائے اور میں بھی سر جھکا کر شرمانے کے قابل ہو جاؤں ۔ آؤ اب چلیں کلاس میں ۔"

ایسی باتیں کرتی ہو ناجیہ کہ میں خود کو بدھو سمجھنے لگتا ہوں ۔ !

اور کیا تم بدھو ہو نہیں ۔ ؟" وہ ہنسی ۔

بار بار مجھے بدھو بھی نہ کہا کرو ناجیہ ۔ !

کیوں ۔ کیسا محبت بھرا لفظ ہے یہ ۔ بدھو ۔ معصوم سا ! ہے نا ۔

نہیں ۔

اچھا میں تمہیں آئندہ پورے نام سے پکاروں گی ۔ محمد رفیع صاحب ۔ مگر ایک مشکل ہے کہ میں جب بھی تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کرتی ہوں میرے سامنے گلوکار رفیع صاحب آجاتے ہیں

دو میرے نہایت پسندیدہ فنکار ہیں ہا۔آ۔ کیا آواز تھی جو کھو گئی۔ اچھا یہ بتاؤ۔ یہی نام تمہارا کس نے رکھا تھا۔؟

" اگر نہیں پسند ہیں تو تم جس نام سے چاہو مجھے پکار سکتی ہو۔"

" تم مجھے صرف اسی لیے لگتے ہو ربیع صاحب کہ تمہاری آواز ایک عظیم گلوکار کے ہم نام ہونے کی رکت سے بہت اچھی ہے۔ اور تم گاتے بھی ہو بہت عمدہ۔ اس لیے رہتے دو یہی نام۔"

اس کے احمقانہ چہرے پر خوشی کی گلابی نظر آئی۔!

سناؤں ایک غزل۔ اس نے پوچھا۔ رات ایک رسالے میں ایک غزل پڑھی تھی بہت اچھی لگی۔ رات ہی کو میں نے اس کی دھن سوچ لی تھی۔! کہو تو سناؤں۔!"

" نہیں۔ بریک میں سنوں گی۔"

یہ حقیقت تھی کہ ناجیہ اسے ہمیشہ بیوقوف بناتی رہتی تھی۔ کبھی اس سے نوٹس لیتی۔ کبھی کوئی کتاب لیتی۔ اور واپس نہ کرتی۔ اکثر اس کی ناپختہ آواز میں گانے سنتی۔ جو وہ بیچارہ بڑی محنت سے بار بار گنگنا کے اس قابل کرتا کہ اسے سنا سکے۔ اور وہ ناجیہ کی ساری مکاریوں کو اس کی محبت توجہ اور التفات پر محمول کرتا رہا۔ اس کی سرشت ہی عجیب تھی۔ دل و جان سے ناجیہ کو چاہتا تھا۔ اس کی چاہت میں نو عمری کی ناسمجھی نہ تھی ایک بالغ اور ذی شعور مرد کی محبت کی سنجیدگی تھی۔ کلاس میں بھی اس کا یہی حال ہوتا۔ پروفیسر اور لیکچرر صاحبان لیکچر دیا کرتے۔ وہ دکھاوے کو کاپیوں میں کچھ اول جلول چیزیں لکھتا اور سارا وقت ناجیہ کی شکل تکتا رہتا۔ اسے اس کی خوشنما آنکھیں بے حد پسند تھیں۔ ایسی گھنی گھنی سیاہ دراز پلکیں تو ربیع نے کہیں دیکھی ہی نہ تھی۔ وہ ننھا سا دہانہ گلابی گلابی رسیلے ہونٹ۔ موہوم سا ٹھنڈی کا گڑھا۔ اور اس کے ہلکے ہلکے گھنگھر پڑے ہوئے خوشنما بال۔ اس کا کاہیدہ اور نا ہیدہ بدن۔ گوری گوری بانہیں۔ ان مرمریں نازک کلائیوں میں کھنکتی ہوئی چھ چھ طلائی چوڑیاں۔ کون سی چیز ناجیہ میں ایسی تھی جو چاہے جانے کے قابل نہ تھی۔ اور اسما کی ایک ایک چیز کو اپنی ملکیت سمجھ کے ربیع چاہتا تھا۔ اس کی

پرستش کرتا تھا۔ وہ اپنی نو عمر محبت میں بالکل سنجیدہ تھا۔ اس قدر سنجیدہ کہ پہروں ناجیہ اس کے حواسوں پر مسلط رہتی تھی۔ اور وہ کھانا پینا پڑھنا لکھنا تک بھول جاتا تھا۔ اس کے اور بھی بھائی تھے۔ دو بہنیں بھی تھیں۔ سب اپنی اپنی عمروں کے حساب سے ایک نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ مگر ایک رفیع تھا۔ حد درجہ احساس جذباتی، زود رنج لڑکا تھا۔ کبھی کبھی بڑی انتہا پسندی سے سوچا تھا کہ اگر زندگی کے کسی حصہ میں ناجیہ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تو وہ بڑی آسانی سے خودکشی کر لے گا۔ اس کے ابا شہر کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ اور رفیع کو علم تھا کہ ان کی الماریوں میں قاتل زہر کہاں محفوظ تھا۔

کس کو نہیں کوتاہی قسمت سے شکایت کس کو گلۂ گردش ایام نہیں ہے

نیلی کوٹھی میں دوسری صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ گھر بھر کے لوگ اور ملازم ہال میں اکٹھا تھے۔ اور جج صاحب اپنی جہازی کرسی پر بیٹھے خونخوار نظروں سے ایک ایک کو دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ پہلے سب سے کیا پوچھ چکے تھے کہ ان سب کے چہروں پر ہوائیوں کے بدلے طوفانی جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بیگم سلمیٰ نے کہا۔

آپ ہی ایک دفعہ اور رقم گن لیتے۔ یاد کیجئے۔ کہیں اور رکھ کے تو نہیں بھول گئے؟ ہم میں سے کوئی بھلا آپ کی الماری میں کیوں ہاتھ لگاتا۔ ؟'

وہ گرجے : "کہیں اور رکھ کے کیسے بھول جاتا۔ پورے اسّی ہزار تھے اب گنتا ہوں تو پورے پانچ ہزار کم ہیں۔ سچ بتاؤ کس نے لیے۔ میرا کام ہی مجرموں کو سزا دینا ہے۔ اگر یہاں کسی پر چوری ثابت ہو گئی تو یاد رکھنا کہ سخت سزا دوں گا۔ پانچ ہزار نکالے۔ اچھا کیا مگر پوچھ کے نکالتے۔ چوری کیوں کی؟ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

سچ مانئے کہ میں نے تو دیکھے بھی نہیں۔! بیگم نے کہا۔

"میں نے بھی نہیں نکالے ڈیڈی، جیسی چاہیے مجھ سے قسم کھلوا لیجئے"۔ عذرا بولیں۔

"سرکار اپنے ماں باپ کی قسم۔ ہماری کیا مجال کہ ہم آپ کی الماری سے پیسے نکال لیتے" نوکر گڑگڑائے۔"ہم تو آپ کے کمرے میں جاتے بھی نہیں سرکار۔"

"ہاں۔ ہاں۔ تم لوگ جاؤ۔ اپنا کام کرو۔" بیگم نے کہا۔ اور جان بچی لاکھوں پائے کے انداز سے نوکر سلام کر کر کے چلے گئے۔ ناجیہ ایک حقیر مخلوق کی طرح دالان کی سنگی دہلیز پر بیٹھی سٹیل کا گلدان رگڑ رگڑ کر چمکا رہی تھی۔ اور ایسی انجان تھی گویا اس واقعہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ اور نہ کوئی بات اس کے کانوں میں جا رہی تھی۔ آنکھیں سکوڑ رکھی تھیں۔ لب بھینچ رکھے تھے۔ اور اپنے کام میں جتی ہوئی تھی۔

ناجیہ!۔ بالآخر جج صاحب نے اسے آواز دے ہی لی۔ "ادھر آؤ۔" یس یور آنر۔ وہ سنگین مجرم کی طرح ان کے حضور جا کھڑی ہوئی۔

"سچ بتانا۔ تم نے نکالے ہیں پانچ ہزار۔" انھوں نے پوچھا۔

خدا کو حاضر ناظر جان کے سچ کہوں گی۔ سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ آپ کے پانچ ہزار روپئے میں نے اگر نکالے ہوں تو ——" اس نے ابھی جملہ پورا نہ کیا تھا کہ بیگم نے بات کاٹ دی۔

"یہ کیا کرے گی۔ اتنی بڑی رقم۔ آپ ہی نے یا تو ڈھنگ سے گنے نہ ہوں گے۔ یا کہیں رکھ کے بھول گئے ہوں گے! پھر سے یاد کیجیے۔"

اور عدالت برخاست ہو گئی۔!

جج صاحب ذرا پست ہو گئے تھے۔ از سر نو الماری کھنگالنے لگے۔ پانچ ہزار روپے ان کے لیے کوئی بڑی چیز نہ تھے۔ مگر انھیں تشویش تھی۔ اگر اتنے روپئے اتنی آسانی سے چوری گئے تو کل پرسوں پھر کوئی چیز ازخود ہو سکتی ہے۔! وہ فکر مند تھے۔

دس بجتے بجتے جج صاحب کورٹ سدھارے۔ بیگم سلمیٰ بھی تو ایک کالج کی پروفیسر تھیں، وہ بھی چل دیں۔ عذرا نے بھی باہر کی راہ لی۔ تب کوٹھی میں سناٹا ہو گیا۔ ناجیہ نے الٹا سیدھا

دھلا ہوا گلدان وہیں لڑھکا دیا۔ بھری بالٹی میں ہاتھ دھو کے سارا پانی ستیاناس کیا اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اپنے کمرے میں آئی۔ دروازہ بند کر کے پردہ برابر کیا۔ اور یکبارگی گھٹنے پر سے شلوار کا پائنچہ نیچے کھینچا تو نوٹوں کا بنڈل بھد سے فرش پر گر گیا۔ تیز نظروں سے وہ بنڈل کو گھورتی رہی۔ پھر ہنسنے لگی۔

کیسے بے چین تھے۔ تھوڑی اتنی سی رقم کے لیے! وہ خاصی بلند آواز سے بولی۔ "ارے روز ہزاروں بٹورا کرتے ہیں۔ ابھی اس دن بیوی کو حساب بتا رہے تھے کہ بلیک لاکھوں سے اوپر جا رہا ہے۔ ہمارے نام سے ریڈ ہلز پر کوٹھیاں خریدنے والے ہیں۔ اب یہ تو اللہ ہی جانے کہ کسی قاتل کو پھانسی سے بچانے کے لیے کتنے گھیٹے ہیں۔ کیا کیا گھپلے کرتے ہیں۔ ایک جو ذرا سی رقم چلی گئی تو چہرہ کیسا ٹست کے رہ گیا تھا۔۔ عاقبت کا تو خیال کرتے ہی نہیں ڈیڈی۔"

چھوٹی سرکار۔ ملازمہ نے دروازہ بجایا۔

اس نے جھٹ کر نوٹ اٹھائے اور اسے کشن کے نیچے چھپاتی ہوئی دروازہ کھول دیا۔

وہ آپ کا رکشہ آگیا ہے۔ چھوٹی سرکار! ملازمہ بولی۔

ایک پیالی چائے اسے دو۔ ایک میرے لیے لاؤ۔ میں کپڑے بدل کے ابھی آئی۔

"جی۔ اچھا۔"

اس روز وہ کالج نہیں گئی۔ بیگم سلمیٰ کی الماری سے تین کامدار ساریاں، عذرا کی الماری سے دو عدد نفیس شلوار سوٹ نکال کے چھوٹی بیگ میں رکھ لیے تھے۔ اور بے حد خوش تھی۔ ماں اور بہن کی اٹھائی جانے والی قیامت کا احساس تک نہ تھا۔ مزے میں سیٹ پر پھیلی پھیلی بیٹھی ہوا کھاتی چلی جا رہی تھی۔ جب رکشہ موڑ پر پہنچا تو بولی۔ "آج کالج نہیں جانا ہے۔ نور خاں۔ آج مجھے اپنے گھر لے چلو!"

اپنے گھر۔ ارے صاحبزادی کاہے کو مذاق کرتی ہیں آپ!

نہیں ۔ سچ ۔ اپنے گھر لے چلو ۔!

کہاں بٹھاؤں گا آپ کو ۔" وہ گھسیا تا ہو کر ہنسا ۔" اچھا آپ کی خوشی لیے چلتا ہوں ۔ دس منٹ بعد رکشا ایک کچے گھر پر رک گیا ۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا ۔ جس میں ہزاروں روزندان بنے تھے ۔ جب نور خاں بوکھلا کر اندر گیا اور بدحواس سا باہر نکلا تو اس کے ساتھ اس کی ماں ، بیوی اور بہن بھی تھیں ۔ تینوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس جگمگاتی ہوئی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں ۔!

آئیے سرکار ۔ اندر آئیے ۔" نور خاں بے چارہ گھبرا رہا تھا ۔ اس کے اس کہنے پر عورتوں کو بھی ہوش آیا ۔ ہاتھوں ہاتھ اسے اندر لے گئیں ۔ اور ایک شاندار دری کوٹھری میں بچھا کے نہایت لجاجت اور شرمندگی سے بولیں ۔

بیٹھیے بی بی ۔!

ہمارے نصیب جاگے ہیں سرکار آج ۔ آپ ہماری جھونپڑی میں آئی ہیں ۔" اس کی بیوی بولی ۔ ناجیہ کی نظریں اس کی بہن زاہدہ پر تھیں ۔ چودہ پندرہ برس کی دبلی پتلی لڑکی تھی ۔ بھولی بھولی صورت ، گندمی رنگت ، فیروزی رنگ کا میلا سا لباس پہنے تھی ۔! اور اس کے سامنے سر نیچا کیے بیٹھی تھی ۔

ناجیہ ان سب سے گھل مل باتیں کرنے لگی تھی ۔ اور ذرا سی دیر میں سب کو بے تکلف کر لیا ۔ وہ تو یوں اس کی گرویدہ ہو رہی تھیں کہ جیسے اسے سر پر بٹھا لیں گی ! ناجیہ تو تھی ہی اپنی فطرت کی منفرد ۔ اس کی بیوی سے بولی ۔

اچھا بھائی ۔ کہو ۔ کیا پکایا ہے آج ۔؟

ارے سرکار ۔ ہمارا کھانا پکانا کیا ۔" وہ شرمندہ سی بولی ۔ کیری پڑی مسور کی دال ہے ، چاول اُبال لیے ہیں ۔ یا پراٹھے ڈال لیے ہیں ۔!

بس تو میں آج تم سب کے ساتھ کھاؤں گی ۔!

ہائے سرکار۔ شرمندہ کر رہی ہیں آپ
نہیں بھائی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں!

نورخاں جھٹ پٹ بازار بھاگا تھا۔ اور سموسے، بسکٹ، نمک پارے کچھ کیلے لے آیا تھا۔ کیتلی میں چائے تھی۔ زاہدہ نے سرخ دسترخوان بچھا کے ساری چیزیں سجا دیں۔ اور الگ تھلگ جا بیٹھی۔ نورخاں نے ہاتھ جوڑ کے اسے سب کچھ کھانے پر مجبور کیا اور خود اس کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کرنے لگا۔!

ناجیہ کے ساتھ نہایت امیر کبیر لڑکیاں پڑھتی تھی۔ مگر وہ انھیں قطعی منہ نہ لگاتی تھی۔ اور اب ان غریب لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ان کی سیدھی سادی باتیں سننا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی باتوں میں مکر و فریب، غرور و تکبر، منافقت اور ریاکاری کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی شخصیتیں اجلی تھیں، باتیں سیدھی سادی تھیں۔ اور اسے ان غریب لوگوں کی ہم نشینی میں عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن ان بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی اچانک آمد اور اس مہربانی کی وجہ کیا تھی۔ پھر جب وہ وقت ہو گیا جبکہ اسے گھر پہونچنا ہوتا تھا تو اس نے نورخاں سے کہا۔

ذرا یہاں آ کے بیٹھو۔ نورخاں۔
وہ فوراً پاس آیا اور ننگے فرش پر ادب سے بیٹھ گیا۔!

ناجیہ نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ملبوسات نکال کے اس کے سامنے رکھ دیئے! پھر پانچ ہزار نوٹ اسے دیتی ہوئی بولی۔

"تم اپنی بہن کے لیے پریشان تھے اب اطمینان سے زاہدہ کی شادی کر دینا۔ مگر ایک بات اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہاری بہن یہ کپڑے پہن کر مجھ سے ملنے میرے گھر کبھی نہ آئے۔ سمجھ گئے۔"

نورخاں کی سانس پھول رہی تھی اور عورتیں بھی آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اسے تک رہی تھیں۔ ان کا یہ حال تھا کہ جیسے بیداری میں خواب دیکھ رہی ہوں۔

ناجیہ کے ذہن میں ماں اور بڑی بہن کے ہونق چہرے گھوم رہے تھے۔ اسے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔!

سرکار۔ میں نے تو آپ کے پوچھنے پر اپنا دکھڑا رو دیا تھا۔ میرا مطلب یہ نہ تھا۔ حضور کہ آپ کو تکلیف دیتا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں بی بی نور خاں کہہ رہا تھا" آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولوں گا: میں آپ کے قدموں پر سر رکھتا ہوں سرکار۔ اتنی بڑی رقم تو میں دو جنم لے کے بھی اکٹھی نہ کر سکتا۔ آپ نے کتنا بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔

آپ کی عمر بڑی ہو بی بی۔" بوڑھی ماں آنچل پھیلا کے اسے دعائیں دیتی ہوئی بولی۔

ہائے فکروں کے ہماری راتوں کی نیندیں حرام تھیں۔ نور خاں جتنا کرایہ لاتا کبھی کبھی تو کھانے پینے میں بھی پورا نہ ہوتا تھا۔ بڑی پریشانی آپ نے دور کر دی صاحبزادی۔ خدا آپ کو اس کا بڑا اجر دے گا۔

ہاں بی بی۔ ادر ادھر زاہدہ کے سسرال والوں نے جلدی مچا رکھی تھی کہ اگر اسی مہینے میں ڈولی نہ اٹھے گی تو وہ رشتہ توڑ دیں گے۔ نور خاں کی بیوی نے کہا: اب اللہ چاہے گا جلدی اس کے فرض سے ادا ہو جائیں گے۔! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

ناجیہ جتنی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ سادگی، خلوص اور محبت کے شہد میں ڈوبی باتیں سنتی رہی۔ دعائیں سمیٹتی رہی۔ دوپہر کو دو بجے اس نے سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر زاہدہ سے باتیں کرتی رہی۔ دہیں اس نے چائے پی۔ اس کا دل خوشی کے مارے پھولا جا رہا تھا۔! خلوص اور بے لوث سلوک تو غریبوں ہی میں ملتا ہے۔ انہیں ریاکاری، دکھاوا نہیں آتا۔ اور سادگی اور محبت کی پرستار ناجیہ بھی تھی۔ اسے تو اپنا امیرانہ ماحول، بناوٹی باتیں اور ایک دوسرے سے پیچھے دبے رہنے کا انداز پسند ہی نہ تھا۔! وہ بھی کوئی سی زندگی تھی جس میں کسی تڑپ کسی چبھن اور کسی اضطراب کی رعنائی نہ تھی۔ یکساں سپاٹ

سے دن رات گذرے چلے جا رہے تھے۔ جس چیز کو چاہا حاصل کر لیا۔ جس شئے کے لئے دل مچلا لے لی۔ کوئی تڑپ، کوئی بے چینی، کوئی غم جب تک زندگی میں نہ ہو، وہ زندگی بھی کیا۔

جب وہ گھر واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ ابھی تک جج صاحب، بیگم اور عذرا واپس نہیں آئی تھیں۔ وہ لباس تبدیل کر کے اپنے خوبصورت باغیچے میں آ گئی۔"

آشنا کس کو کہیں نا آشنا کس کو کہیں۔ لوگ ملتے ہیں مگر مل کر بھی ملتے ہیں کہاں

اپنی یہ کوٹھی اسے بے حد پسند تھی۔ ایسی جگہ واقع تھی کہ اگر تیسری چھت پر کھڑے ہو کے دیکھیں تو حد افق تک مناظر کی گویا تصویر کھینچ جاتی تھی۔ سامنے اونچی اونچی عمارتیں اور بھی تھیں۔ ایک طرف اسٹیشن تھا جس کی چوبیسوں گھنٹوں کی چہل پہل کا پوچھنا ہی کیا۔ ہمیشہ ریلوں کی چھک چھک کے ساتھ اس کی سیٹیوں کی آوازیں ناجیہ کی روزمرہ کی دلچسپیوں کا اہم حصہ بن چکی تھیں۔ اگر اس کا دل نہ لگتا تو چھت پر جا کھڑی ہوتی اور پہروں ریلوں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھا کرتی۔ اور فلسفیانہ خیالات اسے نخوطی بنایا کرتے۔ عجیب چیز ہوتی ہے یہ ریل بھی۔ کہیں کسی کو کسی سے ملاتی ہے۔ کسی کو جدا کرتی ہے۔ کیا دنیا میں آنے جانے والوں کا حال بھی یہی نہیں ہے۔ کوئی آتا ہے۔ کوئی چلا جاتا ہے دنیا کا کارخانہ یونہی چلا کرتا تھا۔ اور جب تک قیامت نہ آجائیگی یونہی چلتا رہے گا۔

اس کوٹھی میں آنے کے بعد اس نے سارے نظاروں سے آگہی حاصل کر لی تھی لیکن ایک گھر باقی رہ گیا تھا! جس کے اندر جھانکنے کی تڑپ اسے بے کل کیے رہتی تھی۔ اس گھر کی کائی لگی سیاہ اور بلند ترین دیوار اس کے شوق و اضطراب کی راہ میں ہمالیہ بنی ہوئی تھی۔ اپنے ہمسایوں کا جائزہ لینا اور ان سے راہ و رسم بڑھانا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ابھی تک تین چار

گھروں سے جان پہچان پیدا کر چکی تھی مگر اسے کوئی پسند نہ آیا تھا۔ ایک گھر میں تو تین چار حد سے زیادہ معمر خواتین تھیں۔ ایک بڑھے صاحب بیچ صحن میں آرام کرسی پر دراز خوفناک سا سگار پی رہے تھے۔ اسے دروازے میں دیکھ کر وہ بیدھے ہوئے۔ اور وہ الٹے پاؤں بھاگ آئی۔ لیکن اب اس اونچی دیوار کے پیچھے رہنے والوں کے بارے میں، اسکا شوق تجسس بڑھ چلا تھا۔ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس پر بند باندھنا ناممکن ہو رہا تھا۔! ایک دفعہ کہیں باہر سے آتے ہوئے وہ اچانک اس بڑے سے آہنی گیٹ کی طرف بالکل غیر ارادی طور پر بڑھ گئی تھی۔ مگر اندر نہ جاسکی۔ چونکہ جج صاحب اس کے پیچھے آرہے تھے۔ اور وہ اس کا گھروں گھروں جھانکنا پسند نہ کرتے تھے۔ لہٰذا وہ رخ بدل کر اپنے گیٹ میں گھس گئی۔ اس نے صرف بہ لا تعداد گملوں اور درختوں کے جھنڈ ہی کو دیکھا تھا۔ چونکہ اسے بھی باغبانی کا شوق خبط کی حد تک تھا! لہٰذا اس گیٹ کے اندر جانے اور نظر بچا کے دو ایک پودے اکھاڑ کے بھاگنے کے ارادے کو وہ دبا نہ سکی۔

اور اس وقت خدا نے اسے سنہرا موقعہ عطا کیا تھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اور اس کا دل بھی گلاب گلاب ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس نے بال برابر کئے۔ لباس پر تنقیدی نظریں ڈالیں۔ اور پھر باغ کے چھوٹے جالی دار گیٹ پر پاؤں رکھ۔ پھلا کو د گئی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ جلدی سے گھوم کے وہ پر کشش اور پُر اسرار سے آہنی گیٹ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے مضبوط کنڈے میں بڑا سا تالا پڑا تھا۔ جو شاید برسوں سے کھلا نہ تھا۔ ذیلی کھڑکی کھلی تھی جو خود بھی اتنی بڑی تھی کہ وہ سر جھکائے بغیر اندر جا سکتی تھی۔ اس نے پہلے صحن کا جائزہ لیا وہ صحن کاہے کو تھا ایک خوشنما پارک سا تھا۔ ہر طرف درختوں کی بہتات، گملوں کی کثرت، پھولوں کی ارزانی بھا گھر تھا۔ کیا آنگن تھا۔ فضا آراستہ چمن پیراستہ۔ ایک ٹھنڈک سی اس کی آنکھوں کی راہ روح میں اترنے لگی۔ اس نے لمبی سی سانس لے کر نہ جانے کون کون سی خوشبوئیں سینے میں کھینچیں اور پھر وہاں کسی کو نگراں نہ دیکھ کر تو بڑی عقیدت سے بسم اللہ پڑھ کر ایک اجنبی

صحن میں قدم رکھ ہی دیا۔ اور بڑی دل چسپی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے جیسے وہ دور دور تک نظریں دوڑا رہی تھی اس کی دل چسپی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ زر سری ہے یہ شاید: اس نے سوچا۔ اس کی نگاہیں اونچی کرسی پر بنی عمارت پر پڑیں۔ بڑا چوڑا سا زینہ تھا جو کافی اوپر چلا گیا تھا۔ اور زینے کے ختم پر ایک بڑی سی بالکونی تھی۔ وہاں ہلکے پھلکے ستون دو دو گز کے فاصلے سے قائم تھے۔ جن پر عشق پیچاں مونگے، جوہی اور گل چاندنی کی ہری بھری بیلیں لپٹی تھیں۔ ایک دروازے پر محراب سی بنی تھی۔ اس پر کاغذی سرخ پھولوں کا ایسا گھنا جھنڈ تھا کہ شاخیں فرش تک جھک آئی تھیں۔

کیا حُسن ہے۔ اس نے تعریفی نظروں سے محراب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کتنا اعلیٰ ذوق ہے اس گھر کے رہنے والوں کا۔ واہ بھئی واہ۔ ایک ہمارا باغیچہ ہے واہیات۔

وہ یہیں کھڑی گرد و پیش کی رنگینی اور خوشنمائی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور یہاں کے خوش ذوق و خوش سلیقہ مکینوں سے ملنے کا اشتیاق لمحہ بہ لمحہ ترقی پر تھا۔ وہ سخت مجلس پسند تھی! اسکول اور کالج میں بھی اس کی سہیلیوں کا جھنڈ موجود تھا۔ اسی شدت سے وہ تنہائی پسند بھی تھی۔ جب تک جی چاہتا سب میں بیٹھ کر ہو حق مچاتی اور جی نہ چاہتا تو گھنٹوں اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ پر اس نے معلوم کرنے کی کبھی پروا ہی نہ کی کہ کون کس طبقے اور کس معیار کا ہے۔ پڑوسیوں سے میل جول بڑھانے ان کے حالات جاننے کا خبط اسے شروع دن سے تھا۔ اگر کبھی جج صاحب یا اس کی امی ہر ایک کی ٹوہ میں لگے رہنے اور ان کے حالات گھر میں بیان کرنے سے منع کرتے تو وہ مولوی عبد القدوس صاحب کے اسٹائل میں کھنکار کر ہمسایوں کے حقوق پر ایسا لیکچر شروع کرتی اگر اس کا سامع صرف ایک شخص ہوتا تو وہ بھی سر تھام کر بھاگ اٹھتا۔ عذرا کہتی تھیں "دیکھ لینا۔ بڑا نقصان اٹھاؤ گی ایک دن۔ کوئی نہ کوئی ایسا چرکہ ہمیں دے گا کہ بھول جاؤ گی یہ تقریر بازی"۔

عذرا باجی بڑی محتاط، تو دو دار اور سنجیدہ لڑکی تھیں۔ چونکہ انھوں نے تعلیم میں ہمیشہ

نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی لہٰذا خود کو ہر تعلیم یافتہ شخص سے بلند و برتر سمجھتی تھیں۔ دوسرے لوگ ان سے مرعوب و متاثر ہو جاتے تھے۔ مگر ناجیہ نہیں۔ حالانکہ وہ ان سے چھ سات سال چھوٹی تھی لیکن ان سے مرعوب نہ تھی! حماقت جواب دے سکتی تھی۔

"کون سی میری جاگیر ہے جو چھین لے گا!"

پھر اس سے سر پھوڑ کے سب ہار گئے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے خیالات اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ دفعتاً اس کی نظر بالکونی کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں سفید لباس میں ملبوس ایک خاتون دکھائی دیں۔ ان کے لبوں پر اسے مسکراہٹ بھی نظر آئی۔ اور وہ کچھ خجل سی ہو گئی۔ کیا سوچے گی یہ محترمہ۔ مان نہ مان۔ گھس آئی ہے ان کے گھر میں۔

"آپ دیر سے وہاں کھڑی ہیں۔ یہاں چلی آیئے۔!"

وہ تو خدا سے یہی چاہتی تھی۔ پردوں کے درمیان سنگی روش پر لمبے لمبے قدم رکھتی وہ زینے تک چلی گئی۔ اور دو دو تین تین زینے چڑھ کر ان خاتون تک پہونچ گئی۔

"تسلیم۔!" اس نے بڑی اپنائیت سے انہیں سلام کیا۔

"جیتی رہیے۔" جواب ملا۔ "آپ ہی آئی ہیں نیلی کوٹھی میں؟ چند دن پہلے میں نے سامان آتے دیکھا تھا۔!"

"جی ہاں۔" ان کی مدھ آواز پر یک بارگی فریفتہ ہو کر ناجیہ بولی۔ "ہم ہی لوگ آئے ہیں۔ ڈیڈی نے خریدی ہے وہ کوٹھی۔ اب یہیں رہیں گے۔"

"اچھا اچھا۔ آیئے۔ اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"جی۔" ناجیہ بری طرح ان پر لٹو ہوئی جا رہی تھی۔ عجیب سی پرکشش اور مسحور کن شخصیت تھی۔ ان میں کوئی ایسی بات تھی جیسے وہ اس کی بہت دیر کی جانی پہچانی ہوں۔

تھے ۔ جدت کی دا ئے ۔ جنہیں نیر زجان نے پا پا ہے
ان کے پیچھے چلتی ہوئی وہ ایک بہت بڑے کمرے میں پہنچی ۔ !

صاف ستھرا بہت فراخ روشن اور ہوادار کمرہ تھا ۔ چاروں طرف بڑے بڑے دروازے تھے ۔ ایک دیوار کے ساتھ لگے تخت بچھے تھے ۔ جن پر سفید چادر کسی ہوئی تھی ۔ اور دونوں طرف گاؤ تکیے رکھے تھے ۔ تختوں کے پاس دیوار کے سہارے بید کی کرسیاں پڑی تھیں ۔ ۔ بیچ میں میز تھی جس پر رنگین کاکور بچھا ہوا تھا ۔

"آپ بیٹھیے ۔ میں ملازمہ سے کہہ کر کھانے اور چائے کا انتظام ۔۔۔"

جی نہیں ۔ بالکل نہیں " تاجیہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا ! ایسا تکلف نہ کیجیے ورنہ مجھے بے حد شرم آئے گی ۔ میں اپنے صحن سے آپ کی وہ اونچی سی دیوار دیکھتی تھی اور پھر کئی بار آپ کے خوبصورت باغ کو دیکھا ۔ اور یہاں آنے سے خود کو روک نہ سکی ۔ آپ سے اجازت لیے بغیر آپ کے گھر آگئی ہوں ۔ آپ نے برا مانا ہوگا :

لمبی سی تقریر کر کے تاجیہ نے سوچا ۔ اس نے کوئی بے ربط بکواس تو نہیں کر دی تھی ۔ شاید بکواس ہی تھی کیونکہ اس کی آمد کی تاویل سن کر جواب میں ان خاتون نے بے حد دل پذیر تبسم کے ساتھ کہا تھا ۔

" اس میں تکلف کی کون سی بات ہے ۔ ابھی میں نے بھی تو نہیں کھایا ۔ کیا حرج ہے ؟ اگر آپ بھی شریک ہو جائیں گی ! ۔ میں ابھی آتی ہوں ۔" یہ کہہ کر ایک دروازے سے نکل کر چلی گئیں ۔

تاجیہ نے اب فراغت سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اسے قدرے صدمہ سا ہوا ۔ یہاں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو جدت اور تازگی کا لیبل لگایا جاتا ۔ شکستہ سی بید کی کرسیاں جن کا بید جھول رہا تھا ۔ بھدے پایوں کی بہت وزنی سی میز اور دھندلے آئینے والی سنگار میز ۔ جو ۔ بے سنگار کی کوئی چیز نہ تھی ۔ بس ایک کنگھا پڑا

تھا۔

دیوار پر ایک بہت قدیم اور جہازی سائز کا کلاک بھی آویزاں تھا۔ اس کا وزنی پینڈولم کسی عمر رسیدہ آدمی کے بوجھل اور کمزور دل کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اس کی ٹک ٹک فضا میں مزید اداسی کا اضافہ کر رہی تھی۔ ایسا احساس ہو رہا تھا کہ جیسے ایک بیمار، افسردہ، بے مقصد اور ناکارہ سی دنیا بس اسی کمرے کی حدود میں ختم ہو چکی ہے۔ باہر کے چمکیلے آفتاب، روشن فضا، مسکراتے ہوئے ماحول اور قہقہہ بلب انسانوں کی دنیا کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ناجیہ کو یہ ماحول یہ اداس کمرہ قطعی پسند نہ آ رہا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ اسے یہ قدامت اچھی بھی لگ رہی تھی، کیونکہ اس کمرے کی مکین کی محبت میں اس نے اپنی زندگی اپنا دل ہار دیا تھا۔ وہ اسے بے حد اچھی لگی تھیں۔ ان میں کتنی کشش تھی، کتنی حسین تھیں ان کی آنکھیں۔ گھنی گھنی پلکوں سے لدی بھنڈی آنکھیں۔ جن کی الم پسندی ان کا حسن اور خوشنمائی تھی۔ ان کی خوبصورت ناک باریک باریک سے ہونٹ۔ اور ان کی منفرد معنبری شخصیت وہ نہایت متاثر ہو کر سوچتی رہتی۔

مجھے ایسی آئیڈیل کی تلاش تھی۔۔!

اور پھر اس کی نظروں سے اپنی ساری لیکچرز، اپنی امی اور بڑی بہن ساری سہیلیاں یکبارگی گر گئیں۔ لوحِ دل پر ایک اجنبی خاتون کی لازوال محبت کا نقش کندہ ہو گیا تھا۔

وہ پانچ ہی منٹ بعد واپس آ گئیں۔ اور اس کے بعد ایک کرسی پر ٹک گئیں۔

مجھے آنے میں دیر تو نہیں ہوئی۔ آپ بیزار ہو رہی ہوں گی۔" وہ مسکرائیں تو ان کے ہموار اور چمکیلے دانت ان کے خوشنما لبوں پر عکس ریز ہو کے چھپ ہو گئے۔

آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کہاں پڑھتی ہیں آپ۔؟ انھوں نے پوچھا

ڈیفنس جونیئر کالج میں۔ انٹرمیڈیٹ کا دوسرا سال ہے۔" وہ بولی۔ اور یہ سوچ کر

کرنے لگی کہ ناحق ان پر اپنی تعلیم کا رعب جمایا۔ یہ کیا جانیں انٹرمیڈیٹ کیا ہوتا ہے۔

اچھا اچھا۔" انہوں نے کہا۔" اب تو ان گنت اسکول اور جونیر کالج کھل گئے ہیں میں نے تو یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کیا تھا۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ تب ہمارا ماحول بھی بہت اچھا تھا۔ ہم اپنے استادوں کی عزت کرتے تھے۔ اور وہ بھی نہایت خوشی اور خلوص سے اپنا علم اپنے شاگردوں میں بانٹتے تھے۔ اب وہ بات نہیں ہے طلباء میں تعلیم حاصل کرنے کی لگن نہیں رہی۔ اور اساتذہ بھی بس اپنا فرض نبھاتے ہیں خلوص کسی میں نہیں۔ نہ ان میں نہ اُن میں۔ اب تو نیا زمانہ ہے نئے لوگ ہیں وہ پچھلی بات ہی نہیں رہی۔ جس کی یادوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔"

اب دم بخود رہنے اور جھینپنے کی باری ناجیہ کی تھی۔ مگر وہ ان کی تقریر کے دوران سر ہلاتی رہی اور پھر تائید میں بولی۔

جی ہاں امی بھی یہی کہتی ہیں۔ وہ بھی ایم۔ اے ہیں اور ان کا خیال بھی یہی ہے کہ آج کل تعلیم جس قدر ارزاں ہو گئی ہے۔ جہالت اور نام نہاد ترقی پُر رہی کی تاریکی زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ ان کے زمانے میں طالبعلم اپنی دماغی محنت کے بل بوتے پر پاس ہوتے تھے۔ اور آج کے طالب علم ریوالور اور چھرے سامنے رکھ کے امتحان دیتے ہیں۔ اور زبردستی پاس ہوتے ہیں۔!

"بالکل یہی بات ہے۔" آپ کی امی غلط نہیں کہتی۔ کہاں پڑھاتی ہیں۔ ؛

"یونیورسٹی میں۔ فیکلٹی آف انگلش کی ڈین ہیں۔ پروفیسر بیگم سلمیٰ۔ ناجیہ نے کہا۔ اور سب کا تعارف کراتی ہوئی بولی۔" ڈیڈی جسٹس ہیں۔" عذرا باجی مجھ سے بڑی ہیں۔ وہ اب ریسرچ کر رہی ہیں۔"

تعلیم یافتہ لوگوں کے حالات سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔" انہوں نے کہا۔ بس تو ایسے ویرانے میں رہتی ہوں کہ یہاں کسی پڑھی لکھی خاتون کی آمد کا سوال

ہی ہیں۔ اکثر دل چاہتا ہے کہ ادبی محفل اٹنڈ کروں۔ بہت دن ہی تھی مجھے کسی زمانے ہیں۔ مگر اب کیا ہے۔ تنہائی ہے اور بس۔"

آپ امی اور باجی سے ملیے۔ وہ ادبی لوگ ہیں۔ امی انگریزی میں ساننٹ لکھتی ہیں۔ اور باجی کا شاعرانہ ذوق بھی بہت اچھا ہے۔ آپ دونوں کو پسند کریں گی۔" ناجیہ بولی۔ اور پھر پچھتائی۔ خدا کرے یہ ان سے اور وہ دونوں ان سے کبھی نہ ملیں ورنہ یہ پیاری سی خاتون اس طرح سب میں بٹ جائیں گی کہ صرف اسی کی نہ رہیں گی۔ جب کہ ناجیہ دم بدم ان کی اس قدر گرویدہ ہو رہی تھی کہ اس کا احساس اور جذباتی دل ان کی بے پایاں محبت میں پگھلا جا رہا تھا۔!

امی اور باجی کو فرصت بہت کم ہوتی ہے۔" جلدی سے اس نے کہا۔

بوڑھے کلاک نے دو بجائے! اور ساتھ ہی ایک بوڑھی بھاری بھرکم ملازمہ نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔

کھانا کمرے میں پہونچا دیا۔ بیٹا۔

چلیے۔!" انہوں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

حالانکہ وہ دو گھنٹے قبل رکتے والے کے گھر میں مزیدار چاول پارز کھو لنس کر آئی تھی۔ اسے بھوک بھی نہیں لگی تھی۔ مگر وہ ان کی مقناطیسی مسکراہٹ سے بندھی فوراً اٹھ گئی۔ مگر رسماً بولی۔

" اگر آپ اس طرح تکلف کریں گی تو میں یہاں آتے شرماؤں گی۔"

کوئی خاص بات نہیں۔ اسے بڑھا چڑھا کے محسوس نہ کیجیے۔" انہوں نے کہا۔ آپ سے مل کے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اب تو میں چاہتی ہوں کہ آپ کسی طرح وقت نکال کر روز آیا کیجیے۔! لیکن اس طرح کہ آپ کی تعلیمی مصروفیت میں کوئی حرج نہ ہو۔"

وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کمرے سے باہر ہی بڑے کھلے کھلے نفاست دالان تھے۔ اور چھ سات زینے اتر کے ایک سرسبز باغ اور تھا۔ یہاں ان گنت پھل دار درخت تھے۔ ایک درخت کیلوں سے لدا کھڑا تھا۔ دو تین درخت امرود کے تھے۔ اور بھی کئی تھے۔ جنہیں ناجیہ ڈھنگ سے دیکھ نہ سکی۔

کھانے کا کمرہ صرف ایک فرد کے طعام کے لیے غیر ضروری تھا۔ لمبی سی میز اور ارد گرد بارہ عدد کرسیاں! وہ ان کے شوہر اور بچوں کی منتظر تھی۔ فی الحال تو کوئی ایسے معمر اور معتبر صاحب دکھائی نہ دیئے تھے۔ نہ کوئی بچہ دِکھائی پڑا تھا۔ سب آفس اور اسکول میں ہوں گے۔ ناجیہ نے قیاس کر لیا۔

بیٹھیے " وہ بولیں۔ آپ تو سچ مچ تکلف کر رہی ہیں۔ ہم آپس میں بھلائے ہیں۔ اور ہم میں اتنی شناسائی تو ہو چکی ہے کہ تکلف اور جھجک کا کوئی محل ہی نہیں۔ شروع کیجئے " انہوں نے خود ہی اس کی پلیٹ میں کوئی خوشبودار چیز نکال دی۔ روٹیوں کی رکابی اور چاولوں کی قاب بھی اس کے سامنے سرکا دی۔

اس نے ہزار برس پرانی دوستی اور اپنا پن کی طرح خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ اور پھر لمبی سی پیالی میں مزیدار چائے پی۔ انہوں نے اسے خوشبودار کتھی ہوئی چھالیہ بھی دی۔ اور پھر باغ کی بڑی دہلیز پر آ بیٹھیں۔ اب ناجیہ کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر جائے۔ اور گھر کے خیال سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ ان سے ملی ہلی بیٹھی تھی۔ اور اس کا بازو بڑی مشکل سے اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس قدر بے قابو ہو رہا تھا کہ اٹھے اور ان کے گلے میں ہار بن کر حمائل ہو جائے۔ بلبلاتے ہوئے بازو کو اس نے بڑی دشواری سے تھام رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی محبت طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔ اتنی خوبرو۔ اتنی پرکشش اور ایسی مسحور کن خاتون

اس نے عمر بھر میں پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ پینتالیس سال سے کسی طرح کم نہ ہوں گی۔ مگر اس ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی ان کے حسن کا کیا غضب ناک عالم تھا کہ چہرے کی طرف نظر بھر کے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ آخر اس کی امی بھی اسی عمر کی تھیں۔ مگر وہ میک اپ کرنے کے بعد بھی اتنی دل کش اور ایسی حسین نہیں لگتی تھیں۔ اسے تو امی کی لپ اسٹک زدہ ہونٹوں ہی سے الرجی تھی۔ اور ان اجنبی خاتون کے ہونٹ قدرتی سرخ اور اس قدر رسیلے سے تھے جیسے ابھی ابھی ان سے شہد ٹپکنے لگے گا وہ بڑی مسحور سی ان کے چہرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اور قطرہ قطرہ محبت دھیرے دھیرے سمندر بن رہی تھی۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے اس کا نام پوچھا۔

"ناجو۔" وہ فوراً بولی۔

"ناجو۔" انہوں نے دہرایا۔

"ناجیہ سلمان۔" وہ مسکرائی۔ "امی اور ڈیڈی ناجو ہی کہتے ہیں۔ میں بھی ناجو ہی کہوں گی۔"

ناجیہ نے ان سے ان کا نام پوچھنے کی ہمت نہ کی۔ نہ انہوں نے بتایا جب ناجیہ ان سے زبردستی فری ہو گئی تو بولی۔

"باجی جان۔ آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔ اتنے بڑے ڈھنڈار گھر میں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا۔؟"

"پہلے ڈر لگتا تھا۔ جب تیز ہوائیں درختوں میں دہشت ناک سیٹیاں بجاتی تھیں جب کبھی برسات کے موسم میں ان درختوں پر پانی برستا تھا۔ بجلیاں چمکتی تھیں اور بادلوں کی گرج گھر کی بنیادوں تک کو ہلا دیتی تھی۔ تب تب بڑا ڈر لگتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ اب تو یہ سب چیزیں یہ عناصر قدرت یہ مناظر فطرت سب میرے دوست

ہیں۔ مجھے تنہائی کے عذاب سے بچاتے ہیں۔ میرے لیے اپنی رنگینی اور رعنائیوں کا حسن نزرانم کرتے ہیں۔ میرا باغ آپ کو اچھا لگا۔!

بہت۔ بہت زیادہ۔ رانشہ کھلی کا ہو کر ناجیہ بولی۔ اسی لیے تو اتنی دیر تک درختوں کے بیچ کھڑی ان کی خوشنمائی اور سرسبزی دیکھتی رہی تھی۔ آپ کا باغبان بہت ماہر معلوم ہوتا ہے۔"

نہیں ناجو۔ باغبان نہیں۔" بڑی اپنائیت سے وہ بولیں۔ یہ سب میں نے ہی چمن بندی کی ہے۔ اب تو دو ہی شوق رہ گئے ہیں میرے مطالعہ اور باغبانی۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے میری زندگی کا دوسرا مشغلہ۔

باجی جان! ایک بات پوچھوں اگر آپ اجازت دیں۔ اور ڈرانہ مانیں ناجیہ ڈرتی ڈرتی بولی۔

ضرور پوچھیے۔! انھوں نے اس طرح مسکرا کر اس کی طرف دیکھا کہ ناجیہ مارے محبت کے ان سے لپٹتے لپٹتے بال بال بچی۔

باجی جان۔ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ۔ وہ وہ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ۔ وہ آپ کے۔ آپ کے" پوری بات اس کے ہونٹوں سے نہ نکل سکی۔ اور وہ گڑبڑا کر ان کی شکل دیکھنے لگی! وہ یہ سننے کے لیے تیار نہ تھی کہ لباسِ سفید لباس میں ملبوس وہ خوبصورت خاتون خدانخواستہ بیوہ تھیں۔!

آدمی اکیلے بھی تو جی سکتا ہے۔" جواب میں انہوں نے کہا۔" بات بس دل کو سمجھانے کی ہے۔ میں ہمیشہ سے اکیلی رہتی ہوں۔ بہت سکون محسوس ہوتا ہے اس طرح۔ ایک زمانہ تھا کہ میرے ماں باپ بڑے دو بھائی ایک بہن بہنوئی ان کے بچے سب تھے۔ گھر بھرا بھرا لگتا تھا۔ انہیں دالانوں میں بھائیوں کے بچے کھیلتے پھرتے تھے۔ اس طرف میری والدہ کا تخت بچھا رہتا تھا۔ اس کے پاس والد صاحب

کی آرام کرسی پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھار آپا اور بھائی صاحب آجاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بے موسم عید گھر میں آگئی ہو۔ مگر۔ زمانہ گر بہت دم آگے بڑھ گیا۔ والدین ایک کے بعد ایک چل بسے۔ بھائی امریکہ میں ہیں۔ بھائی صاحب کے انتقال کے بعد آپا کی ساری خوشیاں مٹی ہو گئیں، ان کے ساس سسر مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے جا رہے تھے۔ آپا اور ان کی بچی کو بھی لے گئے۔ مدتوں سے وہ لوگ نجف اشرف میں ہیں۔ کبھی کبھار ان کا خط آجاتا ہے۔ لڑکی وہیں بیاہ دی ہے۔ مدتوں سے وطن نہیں آئیں۔! بس یہ ہے کہانی میری زندگی کی۔ اگر چند لفظوں میں بیان کروں۔ ورنہ ایک افسانہ ہے زندگی کا۔ بہت طویل اور المناک سا۔ جس کا نہ کہنا اچھا نہ سننا اچھا۔"

وہ چپ ہو گئیں۔ تاجیہ ان کا افسانہ زندگی سننے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور فرمائش بھی نہ کر سکی۔ عمر و مرتبہ کا بڑا فاصلہ تھا دونوں میں۔ وہ پیار سے انہیں باجی جان کہنے لگی تھی۔ درحقیقت وہ اس کی ماں کی عمر کی تھیں۔ زیادہ بے تکلفی انہیں ناگوار گزر سکتی تھی۔! بس وہ افسوس زدہ منہ بنائے بیٹھی رہی۔

بڑی حوصلہ مند ہیں آپ۔" کچھ نہ کچھ کہنے کی خاطر اس نے کہا۔ اس طرح اپنے دکھوں کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ میں تو اتنی ڈرپوک ہوں کہ پل بھر اکیلی نہیں رہ سکتی۔

زمانہ انسانوں کے درمیان کروٹیں بدلتا ہے۔" بے حد سنجیدہ ہو کر انہوں نے کہا: "اور زمانے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے خیالات، محسوسات اور جذبات بھی بدلتے ہیں۔ آدمی محفل پسند ہے۔ معاشرہ میں رہنے والا حیوان ناطق۔ اپنوں کو تلاش کرتا ہے۔ اور سوچتا ہے وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ اسے ماں باپ کی شفقت، بھائی بہن کا تعلق خاطر، دوست احباب کا ساتھ چاہئے۔ اور بہت سے دوسرے ساتھی جو زندگی کے سفر میں ساتھ مل جاتے ہیں۔ شوہر، بیوی، بچے، مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو یہ نعمتیں ملیں۔ کسی کو کچھ نہیں ملتا! اسے یہ سوچ کے دل کو سمجھانا بہلانا پڑتا ہے کہ تنہائی

ہی بہترین ساتھی ہوتی ہے۔ آپ کیا سوچنے لگیں۔؟"

آپ کی باتیں سن کر رونا آرہا ہے مجھے۔" ناجیہ بولی۔" آپ اکیلی ہیں۔ کوئی ساتھی نہیں ہے آپ کا۔ اگر آپ کہیے تو میں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس آکر رہ جاؤں۔ سچ مانیے کہ مجھے امی ڈیڈی بالکل اچھے نہیں لگتے۔ باجی تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں سب کے سب مجھے ہر وقت ڈانٹتے ڈپٹتے اور نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ میرا وہاں جی نہیں لگتا۔ میں چپکے سے اپنا سامان لے کے یہاں آجاؤں۔ ساری عمر آپ کے ساتھ رہوں گی۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔ کتنی خوبصورت ہیں۔ کتنی پیاری ہیں۔ آپ کے پاس سے جانے کا جی نہیں چاہتا۔!۔"

ماں باپ ایک نعمت ہوتے ہیں ناجیہ۔ ان کی نصیحتوں سے بیزار ہونا اچھا نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سب آپ کی بھلائی کے لیے کہتے ہیں" انہوں نے نصیحت ہی کی۔" ایسا قدم نہ کیجیے گا کہ لوگ ہمیں شک کی نظروں سے دیکھیں سمجھیں میرا مطلب۔؟

" جی۔"

پھر چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ناجیہ کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا اور شاید ان کے پاس بھی تھا۔ لیکن کہنے کا پیرایہ ناجیہ کو معلوم نہ تھا۔ اور وہ کہنا چاہتی نہ تھیں۔!

پھر وہ ڈھائی بجنے پر اٹھ گئیں!

" آپ تب تک اخبار اور رسائل دیکھیے۔ اندر کمرے میں رکھے ہوں گے۔ میں ذرا ظہر کی نماز پڑھ لوں!" وہ بولیں۔ ناجیہ بھی ساتھ کھڑی ہو گئیں۔

اسے بڑی دیر ہو گئی تھی گھر سے نکلے ہوئے۔ اگر بیگم سلمیٰ اور عذرا آگئی ہوں گی تو اسی کو برا بھلا کہہ رہی ہوں گی۔ اگر ڈیڈی لنچ کے لیے آئے ہوں گے تب تو اسی کی شان میں قصیدے زیادہ ہی پڑھے جا رہے ہوں گے۔! طوعاً وکرہاً اس نے ان سے رخصت کی اجازت لی۔ اور دوسرے دن آنے کا

وعدہ کرکے چلی گئی!

جو لمحے جا چکے اب ان کو ہم لوٹا نہیں سکتے ہماری دسترس میں حرف نغمانہ بار سا کیا ہے

جج صاحب اور دوسرے لوگوں نے بڑی حیرت سے وہ تبدیلی نوٹ کی تھی جو ناجیہ کے مزاج میں آ گئی تھی۔ سنجیدگی اور متانت کا تصور تک اس کے ساتھ وابستہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے اس کی تخلیق میں مٹی کے علاوہ پارہ بھی استعمال کیا تھا۔ پل بھر جو سکون سے بیٹھ سکتی تھی۔ نہ کبھی وہ سنجیدہ ہوتی تھی۔ مگر اب بڑی بوڑھی کی سی سنجیدہ متین بن گئی تھی۔ اپنی پالتو بلی۔ اپنی فضول سی مصروفیات، سائیکل کی سواری اور پتنگ بازی سے اس نے اس طرح ہاتھ اٹھا لیا کہ جیسے ان ساری چیزوں کا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ اب تو اسے کالج کے نام سے بھی لرزہ چڑھتا۔ دوسرا تیسرا دن تھا کالج سے ناغے کا۔ ناغے کر رہی تھی مگر کسی کو اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔

بالآخر تیسری صبح ناشتے پر جج صاحب نے پوچھ ہی لیا۔

"کالج میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ مسلسل ناغے کر رہی ہو۔ غیر حاضری لگ رہی ہوگی۔"

"اب میں آگے نہیں پڑھوں گی۔"

کیوں۔ کوئی وجہ۔ سبب۔؟"

جی نہیں چاہتا۔"

لوگ کیا کہیں گے۔ جج صاحب کی دو لڑکیوں میں کتنا فرق ہے۔ ایک ایم۔ اے پی ایچ ڈی اور دوسری صرف میٹرک۔ ناتمام انٹرمیڈیٹ کا ذکر کون کرے گا۔

کسی کے کہنے سننے کی مجھے کیا پروا۔ ڈیڈی۔

آخر مجھے وجہ تو معلوم ہو۔!

کوئی وجہ نہیں ہے

تو پھر۔!

ڈیڈی آپ کو معلوم نہیں۔" عذرا نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "یہ لوفر ٹائپ نکل رہی ہے۔ کالج تو جا ہی نہیں رہی ہے اس لیے کہ ہمسائے میں کسی سے دوستی کر رکھی ہے۔ اب دیکھیے کہ آپ کے جانے کے ساتھ ہی گھر سے نکلے گی اور پڑوس میں پہونچ جائیگی پتہ نہیں وہاں کون لوگ ہیں۔ کیسی فطرت کے ہیں۔ اس طرح دن دن بھر وہاں رہنا کیا کوئی اچھی بات ہے۔

باجی!" ایک لفظ ناجیہ کے لبوں سے نکلا۔ اور وہ اس طرح خونخوار نظروں سے عذرا کو گھورنے لگی کہ بالکل ایک نئی لڑکی لگی۔

"آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ کسی کے نیچر یا فطرت کے بارے میں منہ کھولیں۔ میں بے شک پڑوس میں جاؤں گی، سمجھیں آپ۔ اور سارا سارا دن وہاں گزاروں گی۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے وہاں جانے سے روک نہیں سکتی۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیجیے۔ انہیں سے ٹکرا کر مرجاؤں گی!۔

ناجیہ۔" جج صاحب نے نہایت ناگوار لہجے میں کہا۔

اس طرح زبان چلاتے ہیں بڑی بہن سے۔ بیگم نے بھی ملامت کی۔

بڑی بہن۔" استہزائیہ انداز میں وہ بولی۔ "نہ دیکھا نہ بھالا ان سے بلیں پیس رائے قائم کرلی۔ آپ کو معلوم بھی ہے۔ وہ امی کی عمر کی ایک خاتون ہیں۔ بی۔اے آنرز اور ایم۔اے اور اتنی حسین کہ آپ اگر ایک دفعہ دیکھ لیں، تو پلکیں جھپکانا بھول جائیں۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگتی ہیں۔ میں انہیں کے پاس جاتی ہوں۔ وہاں ان کے ایک بوڑھی ملازمہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ نہ کوئی مرد۔ نہ بچہ۔ سمجھیں آپ بھی۔

معلوم نہیں کون ہیں۔ کیا ہیں۔" بیگم سلمیٰ نے زبان کھولی۔ بڑی تشویش سے بولیں۔" کہاں سے آ کے ہمسائے میں رہی ہیں۔ اس بے وقوف سے کیا باتیں کی ہیں کہ ان ہی کا کلمہ پڑھنے لگی ہے۔ ایسی سن رسیدہ عورتیں بڑی گھاگ ہوتی ہیں۔ تباہ کر دیتی ہیں نوعمر ناسمجھ بچیوں کو۔ ان کے پاس جانا اور اتنی اتنی دیر تک ان سے چپکے رہنا اچھا نہیں۔"

ان سے پوچھ کے بتانا کہ آرز کے ہجے کیا ہیں۔" حقارت سے عذرا نے کہا۔

جی بہت اچھا۔" طنزیہ لہجے میں ناجیہ بولی۔" پوچھ کے بتاؤں گی۔ اور یہ بھی کہہ دوں گی کہ آج کل کے ریسرچ اسکالرز آپ کے علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مگر شان بڑی جتاتے ہیں۔ اور ڈینگیں بھی خوب ہانکتے ہیں۔"

یہ تم مجھے کہہ رہی ہو۔؟" عذرا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔" دیکھا امی آپ نے ایک ایم اے پاس خاتون کی صحبت کا اثر۔ دو ہی تین دن میں زبان منجھ گئی۔"

ناجیہ۔ تم آئندہ سے ان کے پاس نہیں جاؤ گی۔! میں کہے دیتا ہوں۔" ایک وارننگ اس پر مسلط کر کے جج صاحب نے کرسی سرکائی۔ اور اٹھ گئے۔

میں جاؤں گی ڈیڈی۔ باپ کے مقابلہ میں کھڑی ہو کر اٹل لہجے میں ناجیہ بولی۔" میں روز جاؤں گی! دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔!

ناجیہ تم اتنی گستاخ اور زبان دراز ہو گئی ہو؟۔ بیگم نے حیرت کہا۔

میں ان کے پاس جانے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔" ناجیہ نے کہا۔ نہ میں زبان دراز ہوں نہ گستاخ۔"

بیگم۔ جج صاحب نے دفعتہً اپنا بیٹا یاد کرتے ہوئے انصاف سے کام لیا۔" یہ اگر نہیں مانتی تو تمہیں کیوں نہ ایک دن ان کے ہاں ملنے چلی جاؤ۔ اور دیکھ آؤ۔ وہ محترمہ کیسی ہیں، کیا ہیں، اور ان سے اس کی وابستگی کی وجہ کیا ہے۔"

آپ کہتے ہیں تو میں کسی دن شام کو وقت نکال کر جاؤں گی۔"

نہیں۔ امی وہاں نہیں جائیں گی! ناجیہ بولیں۔ اس کی آواز میں اتنی سنجیدگی اور سرد تھی کہ جج متحیر و متعجب نگاہیں اس پر گڑو گئیں۔

کیوں نہیں جائیں گی۔؟ جج صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

اس لیے کہ ان سے صرف.. میں ہی محبت کرتی ہوں"۔ ناجیہ نے دلیل پیش کی: ان کی سی تعلیم یافتہ امی بھی ہیں اگر دونوں میں دوستی ہو گئی اور ان کی توجہ بٹ گئی۔ انہوں نے مجھ سے محبت کم کردی تو میں برداشت نہیں کرسکوں گی۔ بیمار ہو جاؤں گی' مر جاؤں گی۔ اس لیے امی وہاں کبھی نہیں جائیں گی۔!" یہ کہہ کر اس نے بھی.. تیزی سے کرسی کھسکائی اور اپنی بھری پیالی چائے چھوڑ کر طعام خانے سے چلی گئی۔

دیکھ لیا۔ اپنے دلار کا نتیجہ"۔ بیگم نے شوہر سے کہا۔" آج آپ کے مقابلے پر آگئی۔ ہمیشہ آپ سے کہا تھا کہ لڑکی کو لڑکی ہی سمجھیے۔ اسے لڑکا نہ بنا دیجیے۔ مگر آپ نے میری بات کبھی نہیں مانی۔ بچپن میں اس کی زبان سے ایسی بولیاں سُن سُن کے ہنستے تھے۔ اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ اب رو دیے۔"

وہ میرے سمجھانے سے سمجھ جائے گی۔ اس کے ساتھ سختی نہ کرنا۔ اپنی ضد پر اڑ جائے گی تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔" جج صاحب نے کہا۔

ارے۔ سخت حیرت اور تعجب سے بیگم بولیں۔" یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ آپ اس سے ہار جائیں گے کیا۔!

میں ہار جیت تو نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج کے بچے اپنا الگ دل دماغ لے کے بڑے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ان کے خیالات جذبات اور مرضی یا پسند ناپسند والدین کی مرضی یا رائے سے مطابقت رکھتی ہو۔ بڑوں کی زیادتی یا سخت گیری اور بچوں کی ضد کا ٹکراؤ نقصان دہ اور ضرر رساں ہے۔

اسے میں نرمی اور آہستگی سے سمجھاؤں گا۔" جج صاحب کے مزاج میں پھر بھی کس قدر نرمی اور لچک تھی۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو چاہتے تھے۔ عذرا کو اس کی ذہانت اور فراست کی بنا پر، ناجیہ کو اس کی شرارت اور شوخی اور معصومیت کی وجہ سے انہیں ایک لڑکے کی آرزو تھی۔ عذرا کے بعد کئی برسوں تک سناٹا رہا۔ پھر جب دوسرے حالات سے ہوئیں تو امید بندھی کہ اب کی شاید بیٹا ہوگا۔ مگر ان کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ تب ان لوگوں نے چاروں طرف سے بیٹی ہی کو بیٹا بنا لیا۔ چھ سات سال تک وہ مردانہ لباس پہنتی رہی تھی۔ اور مردانہ بولی بولتی رہی تھی۔ [illegible] اسے کھیل مردوں کے سے آتے تھے۔ سائیکل چلانے، پتنگ اڑانے، گلی ڈنڈا کھیلنے یا کشتی لڑنے میں اسے [illegible] بھر دس بارہ سال کی ہوئی تو کرکٹ، [illegible] ہاکی اور آس پاس کے لڑکے لڑکیوں کو اکٹھا کر کے ہنڈ کی کھیلنے لگی۔ اسے کسی نے منع نہ کیا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں جب اسے اپنی لڑکی ہونے کا احساس ہوا تب اس نے مردانہ کردار تو ختم کر دیا۔ مگر اس کی تیزی، طراری، شوخی، شرارت اور ضد برقرار رہی۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی یہ ساری عادتیں پختہ ہو گئیں۔ ایسی چوب خشک بن گئی جو ٹوٹ تو سکتی تھی، مگر موڑنے کی کوشش میں ٹوٹ جاتی۔!

جج صاحب مردکی لاپروا اور لاابالی فطرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کو بچپن پر محمول کر کے زیادہ پریشان ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر ماں اور بڑی بہن کو ایک مستقل فکر لگ گئی۔ بہن کو اپنی توہین اور اہانت کا غصہ تھا۔ اور ماں کو یہی فکر تھی کہ بہرحال ایک دن اسے پرائے گھر جانا ہے۔ تب کیا ہوگا۔ کیا ساس، سسر، نندیں اور شوہر اس کا مزاج سنبھال لیں گے۔ مزاج داری کریں گے۔؟

میں ایک د ... بے جاؤں گی پڑوس میں۔" عذرا نے سرگوشی میں کہا۔
ودہمارا حال دیکھ آؤں کی ... اتنی زیادہ فکرمند اور پریشان بھی نہ ہوں۔ ابھی نئی
نئی دوستی ہے۔ رنگ گہرا چڑھا ہے۔ کچھ دنوں بعد یہ چڑھی ہوئی ندی اتر
جائے گی ... ا!"

"مگر اپنے باپ ... بے پروائی تو دیکھو!" بیگم نے بڑی حیرت سے کہا۔ "کسی
بات کی اہمیت نہ سمجھیں۔ بلا سے۔ مگر انتہا ہوگئی ہے کہ بیٹی ہی کی تابعدار ہیں۔
لنے لگے ہیں۔ دراصل ان ہی نے اسے شتر بے مہار کیا ہے۔ اب بھگتیں
..."

... بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔" پھر عذرا یہ کہہ کر اٹھ گئیں کہ وہ ناجیہ کی
... کریں گی۔ بیگم بھی کالج جانے کے لیے اٹھ گئیں۔ دس منٹ بعد ہی انہوں
... عذرا کو پکارا۔ وہ بدحواس سی دوڑی آئیں۔ اور ماں کی ہونق شکل
دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"... نے پہننے کے لیے میری ساڑیاں نکالیں؟" بیگم پریشان تھیں۔"
... سیٹھ کے بچے کے عقیقے پر پہننے کے لیے لائی تھی۔ تین تین ہزار کی تھیں
... ہو۔ ہیں؟ اسی الماری میں رکھ دی تھیں میں نے۔" د
وہ پیلی گھاس، سرخ انناس اور موتیوں کے کام کی ساڑیاں۔!" عذرا
نے پوچھا۔

... کہاں گئیں۔ میں سمجھیں تھی کہ تم لے گئی ہو۔
... ہماری ساڑیاں بہن کے ہیں کہاں جاتی امی۔" عذرا نے کہا۔ "کیا
... میں کوئی آسیب گھس آیا ہے؟ اس دن ڈیڈی کی الماری سے رقم غائب
... کی ساڑیاں! ناجیہ کو بلا کے پوچھیے۔

چنانچہ ناجیہ سے استفسار ہوا۔ وہ جھوٹ بہت بولتی تھی۔ مگر اب خشک چہرہ بنا کر روکھے لہجے میں بولی۔

"مجھے کیا کرنا تھا آپ کی ساڑیاں لے کے۔ کیا میں پہنتی ہوں۔" یہ کہہ کر چل دی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایسی ہی ہذیانی چیخ عذرا کے منہ سے برآمد ہوئی۔

"ہائے امی۔ دو شلوار سوٹ میری الماری میں بھی نہیں ہیں۔ یہ کیا آفت آئی ہے ہمارے گھر میں کون چور گھسا ہے کہاں گئے میرے سوٹ۔ ابھی پہنے بھی نہ تھے۔"

"یہ حرکت ضرور شرفو کی ماں کی ہے۔" بیگم بولیں۔ "اب نکال باہر کروں گی اسے۔ ڈھائی سو روپے تنخواہ کھا رہی ہے نامراد کو۔ چوریاں کرنے لگی ہے۔"

شرفو کی ماں سے بیچاری بیوہ عورت گھر میں اوپر کے کام کاج پر رکھی گئی تھی۔ اس سے پرسش ہوئی۔ مگر اس نے روتے ہوئے جب اپنے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسمیں کھائیں تو پھر یہی سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ یہیں آخر کس نے؟ ایک جج کے گھر میں چوری۔ جس کا کام مجرموں کو سزا دینا تھا۔ کتنی عبرت انگیز بات تھی۔! جج کے گھر میں تو چور کا بچہ بھی نہیں گھس سکتا۔! پھر کیا کپڑوں کے پر اُگ آئے تھے۔ دل شکستہ سی بیگم اور عذرا جب اپنے اپنے کالج سدھاریں تو ناجیہ بہت ہنسی۔ اور نہایت گستاخی سے زیر لب بولی

"اُلٹے لٹک جاؤ گے تم لوگ۔ مگر پتہ نہ چلے گا کہ قیمتی ملبوسات کیا ہو گئے۔ مگر کتنا دل خوش ہے میرا [illegible] جیسے [illegible] دیا کیا! [illegible] نہ دے گی مجھے۔"

ملازم نے [illegible] سے چہرہ نکالا۔ "وہ چھوٹی بی بی۔ کوئی صاحبزادے ہیں آپ سے ملنے آئے ہیں۔ [illegible] ان سے [illegible] آپ گھر میں نہیں ہیں۔"

"کیوں کہدو گی تم ایسا؟ [illegible] ملنے والے ہیں۔" ناجیہ نے کہا۔ "[illegible]

بار ہی ہوں باہر۔ اُن کے لیے چائے، سموسے، بسکٹ بھجوا دینا۔

"جی بہت اچھا۔"

دیوان خانے میں آئی تو جہازی صوفے کے ایک گوشے میں اس کا کلاس فیلو رفیع بیٹھا نظر آیا۔ جس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اسے دیکھ کر مری ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی!۔

ارے۔ تم ہو؟" ناجیہ نے کہا: "گھر کا پتہ کیسے معلوم ہو گیا۔ اور آئے کیوں ہو؟"۔

نہیں آنا چاہیے تھا کیا۔؟" اس نے گلوگرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ "کیوں اس طرح پوچھ رہی ہو کہ آئے کیوں ہو؟"

نہایت عمر رسیدہ خاتون کی طرح تھکی کی آہ بھر کر وہ اس کے سامنے ٹی پائی پر بیٹھتی ہوئی بولی" میرا مطلب یہ تھا کہ بھائی میرے والدین باوجود نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود سخت قدامت پسند اور تنگدل ہیں۔ وہ میرا مخلوط تعلیم حاصل کرنا تو مجبوراً برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی لڑکے کا اس طرح گھر پر آکر مجھ سے ملنا جلنا پسند نہیں کر سکتے۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہیں یہاں دیکھ کے کچھ کہہ دیں تو تمہارا دل بُرا ہو جائے گا۔"

کیا وہ ہیں گھر پر۔" گھبرا کے اس نے پوچھا۔

فی الحال تو نہیں ہیں۔ ہاں کہو۔ کیسے چلے آئے؟" وہ مسکرائی۔

سچ سچ کہہ دوں ناجیہ۔

اے لو۔ تو کیا خدانخواستہ تم جھوٹ بولو گے!۔"

ناجیہ۔ آج تیسرا روز ہے۔ تم کالج نہیں آئیں!" وہ گھگھیا کے بولا۔" میں تو بہت پریشان تھا کہ نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ خدانخواستہ جی خراب

ہو گیا ہے۔ یا کالج آنے سے کسی نے منع کر دیا ہے۔ طرح طرح کے خیالات ستاتا رہے تھے مجھے میرا دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ پھر جب لاکھ سمجھانے پر بھی دل نہ مانا تو میں نے کالج کے رجسٹر میں تمہارا پتہ دیکھا۔ اور تمہاری خیریت پوچھنے آگیا کیوں نہیں آرہی تھیں کالج۔؟"

"میرے آنے نہ آنے سے تم اتنے پریشان کیوں ہو بھئی۔؟"

تقریباً دو سال سے میرے ساتھ پڑھ رہی ہو۔ اور پھر بھی تمہیں میرے محسوسات کا اندازہ نہیں ہوا۔ ناجیہ۔ خدا کی قسم میں چاہتا ہوں تمہیں۔ بہت چاہتا ہوں تمہیں دیکھ دیکھ کے جیتا ہوں۔ تمہارے خیالوں میں ڈوبا رہتا ہوں۔ تم میری زندگی بن کر رہ گئی ہو۔ یہ مانو۔ ناجیہ کر۔۔۔۔؟"

ملازمہ ایک بڑی سی سینی میں خشک پھل، سموسے، بسکٹ، اور نمک پارے رکھے لائی۔ اور بڑی میز پہ طشتریاں رکھ کے یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ ابھی پانچ منٹ بعد چائے لاتی ہوں۔

"خواہ مخواہ کا تکلف کیا۔" رفیع نے کہا۔ اس کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔

"مہمان کے لیے تکلف تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" ناجیہ نے کہا۔ اس کی عاشقانہ بکواس سے جل گئی تھی!۔

"میں مہمان نہیں ہوں!" اس نے احتجاج کیا۔ اور مجبوراً اٹھ کر میز کے پاس جا بیٹھا۔ تکلفاً ایک نمک پارہ چٹکی میں دبایا اور بولا۔

"چائے وائے مجھے نہیں پینی ہے۔ بس تم مجھے جواب دو کہ تم کالج کیوں نہیں آئیں۔؟" اور کب آؤ گی۔ تاکہ میں بھی اس دن آؤں۔ ورنہ تم نہیں آؤ گی تو میں بھی نہیں آؤں گا۔

"نہایت شاید جل بھن کر ناجیہ بولی۔

اور اگر میں کبھی نہ آؤں۔ زہر پی کے مر جاؤں تب۔"

جب میں سنوں گا کہ تم زہر پی کر مر گئی ہو۔ اسی وقت میں بھی عثمان ساگر میں ڈوب کر مر جاؤں گا!

رفیع صاحب ایک بات بتلائیے گا!۔

پوچھو!۔

آپ کی عمر ماشا اللہ کیا ہے۔؟

انیس سال۔ ابا کے ساتھ دو سال کے لیے کراچی نہ چلا جاتا تو آج بی۔ اے میں ہوتا۔

نہیں۔ میں تو یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اس کچی سی عمر میں آپ کو ایسے کتابی ڈائیلاگ بولنا کس طرح آ گیا۔" ناجیہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "یہ تو بڑی عمر کے آدمیوں کے بولنے کے ڈائیلاگ ہیں۔ آپ سمجھے۔

خیر۔ تم مذاق سمجھو۔" رفیع نے اس کے ہاتھ سے سموسوں کی طشتری لے کر بستر پر واپس رکھتے ہوئے دل گیر لہجے میں کہا۔

جو کچھ میں تم سے کہنا چاہتا تھا ناجیہ۔ میں نے کہہ دیا۔ میں منتظر ہوں ایک ایک لمحہ گن کے دن شمار کر رہا ہوں۔ کوئی ڈگری مجھے مل جائے گی۔ میں برسرِ کار ہو جاؤں گا۔ خدا مجھے اس قابل کر دے گا تو میں جج صاحب سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا! اس دن کے لئے جی رہا ہوں میں۔ اتنی بے پایاں محبت میرے دل میں تمہاری ہے ناجیہ کہ۔ میں ڈوب گیا ہوں۔ مجھے خود اپنا ہوش نہیں ہے۔ اگر تم سے مجھے ایک مثبت جواب نہ ملا تو شاید میں زندہ ہی نہ رہ سکوں گا!۔

رفیع صاحب! دراصل میں بہت حقیقت پسند ہستی ہوں۔ ناجیہ نے بڑے

سکون سے کہا۔ " لہٰذا تم چاہے مجھ سمجھو کہ نہ سمجھو۔ مجھے ایسے مکالمے پسند نہیں میں اس محبت کو بھی نہیں مانتی۔ عمر اور حالات کے ساتھ ساتھ آدمی کے خیالات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ میں اگر تمہاری لن ترانی پر ایمان لے آؤں۔ اور آج سے پانچ سال بعد تم پر، تمہاری محبت پر میرا ایمان ڈگمگا جائے تو بتاؤ۔ پھر کیا حشر ہوگا۔ میرا۔

اور یعنی بات دراصل یہ ہے کہ میں محبت کے نام سے الرجک ہوں۔ مجھے اپنے ماں باپ اور بہن بھی سے محبت نہیں تو تم سے کیا ہوگی۔ ہم کلاس فیلو ہیں اگر میں نے آئندہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تو کلاس فیلو ہی رہیں گے۔ ورنہ۔ پھر تمہاری راہ الگ اور میری الگ۔

دل سے کہہ رہی ہو۔؟"

بالکل۔" ناجیہ بولی۔" ملازم چائے لے آئی۔ کچھ لمحوں بعد رفیع نے پھر کہا۔

مجھے کچھ بھی نہیں سمجھتیں تم۔!

صرف دوست اور بس۔

شادیاں بھی تو دشمنوں سے نہیں ہوتیں۔!

ہائے خدا۔ تو تم شادی پر ادھار کھائے بیٹھے ہو۔

لیے وقت پر تمہارے والد صاحب کے سامنے اپنا پرپوزل ضرور رکھوں گا۔

لیکن رفیع صاحب! تمہیں نہیں معلوم کہ مجھے تو شادی ہی نہیں کرنی ہے۔ میں نے ساری زندگی یوں ہی رہنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔

تمہاری سنے گا کون؟"

ضروری ہی کیا ہے کہ کوئی سُنے بھی ۔! میں اپنی مرضی کی آپ مالک ہوں ۔
" آج سے کئی سال بعد اگر میں تمہاری نظروں میں سما سکا، میں کسی قابل ہو سکا تو کیا تب بھی تمہارا ارادہ یہی رہے گا ۔ یا تمہارا انکار اور ناراضامندی صرف میرے ہی سلسلے میں ہوگی ۔ ؟
شادی تو ایک مرد سے ہوگی نا ۔ اور میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ مجھے مردوں سے سخت نفرت ہے !۔
تمہارے باپ، چچا، ماموں ۔ یہ سب بھی تو آخر مرد ہیں ہیں ۔ کیا ان سب سے تمہیں نفرت ہے ۔؟
یہ بڑے قریبی رشتے ہیں ان سے اگر مجھے نفرت نہیں ہے تو محبت بھی نہیں ہے ۔
اپنے خیالوں میں نرمی اور لچک پیدا کرو ناجیہ ۔ خدا کے لیے تم میرا اور میری عمر کا مضحکہ اڑا رہی ہو ۔ " وہ اب گڑگڑانے لگا تھا ۔ " مگر میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے جذبوں میں سچا ہوں ۔ آج، کل، پرسوں، دس سال بعد بھی میں اپنے جذبوں میں سچا رہونگا ۔ تم یقین کرو ۔ ناجو ۔ میں بہت چاہتا ہوں تمہیں ۔ "
جس شے کو تم چاہتے ہو ۔ رفیع ۔ اسے حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کیا کرو ۔ ساری چاہت، محبت اور سارے جذبے بعد کو مر جاتے ہیں ۔ راکھ ہو جاتے ہیں اور صرف نفرت اور بیزاری باقی رہ جاتی ہے ۔ ناجیہ نے کسی کتاب میں پڑھا ہوا مکالمہ دوہرا دیا ۔ اور اٹھ گئی ۔
" اب اجازت دو بھئی بہت وقت خراب ہوگیا ۔ مجھے ایک ضروری جگہ بہت جلدی جانا تھا ۔

"نہیں جو کچھ کہنا تھا۔ کیا تم نے کہہ دیا۔" رفیع بولا اور وہ بھی کھڑا ہو گیا۔"

ہاں۔" ناجیہ نے کہا۔" میری دلی تمنا ہے کہ تم پڑھ لکھ کے ایک قابل آدمی بنو۔ اور پھر ایک اچھی لڑکی کو زندگی کا ساتھی بنا دو۔ اور اپنے دل سے میرا خیال ہمیشہ کے لیے نکال دو۔ اچھا۔ بھئی۔ اب چلتی ہوں۔"

رفیع نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ طویل سانس لی۔ اور کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

حسرت کی یہ عمر ہے۔" اپنی عادت کے مطابق اس نے بڑبڑاتے ہوئے سوچا" آپ صرف انڑ میں کر رہے ہیں۔ اور مجنوں اور فرہاد کے کان کاٹنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ لڑکے فلم میں آنکھیں پھوڑ پھوڑ کے اور ٹی۔ وی کے بیہودہ مناظر دیکھ دیکھ کے خود بھی اسی ٹائپ کا بننا چاہتے ہیں۔ او۔ خدا۔ ڈیڈی۔ ممی اگر سن لیں۔ کہ میں نے کلاس فیلو سے پریم اسٹارٹ کر رکھا ہے تو زندہ کھال کھینچ کے رکھ دیں۔ بھُس بھرنے کی بھی زحمت گوارہ نہ کریں۔ اور۔ دو عذرا صاحبہ۔ ارے میرے باپ۔ اُف۔! وہ اگر بھانپ لیں تو دو کانوں کے بیچ میں ناک کر دیں۔ توبہ۔ یا خدا۔"

برتن لے جاؤں۔ سرکار۔" ملازمہ نے پھر اندر جھانکا۔

لے۔ لو۔ ٹھہرو تو۔ مارکی کن تزانی میں میں نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ برتن دس منٹ بعد لے جانا۔ اور تبھی خوب گرم چائے بھی لیتی آنا۔ اچھا۔؟"

جی اچھا!!۔ ملازمہ مسکراتی ہوئی نکل گئی۔! ناجیہ نے بڑی میز کی دراز سے ایک خاکی لفافہ نکالا اس میں ساری طشتریوں کی چیزیں انڈیل لیں اور لفافے کو نیچے کر کے چائے کا انتظار کرنے لگی۔

اب دن خاصا گرم ہو گیا تھا۔ کالج وہ آج بھی نہیں گئی! مسکرا رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ یہ سب چیزیں لے جا کے اپنے ہاتھ سے ان حسین خاتون کو کھلائے گی تو وہ خوش ہوں گی کہ ناگواری محسوس کریں گی۔

چائے پی کر وہ کھڑی ہو گئی۔ قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ لباس ٹھیک تھا۔ چہرہ بھی تر و تازہ اور کھلا ہوا گلاب تھا۔ اس نے لفافہ سنبھالا اور باغ کی راہ سے اتر کر دوسرے باغ میں پہنچ گئی!۔

پچھلی شام کو بے موسم تھوڑی سی بوندا باندی ہو گئی تھی! اور اب سارے درخت نہائے دھوئے سرسبز چمکیلی عبائیں پہنے گویا خوشی سے جھوم رہے تھے۔ چمکدار پتوں پر قطروں کا جمنا دشوار تھا۔ کسی بڑے سے پتے پر پانی کے قطرے اب بھی موجود تھے۔ اور سورج کی کرنوں میں دھنک رنگ ہو رہے تھے۔

بوڑھی ملازمہ جو مارے موٹاپے کے چبوترہ بن گئی تھی' ہاتھ میں باسکٹ لیے کچھ لاتے جا رہی تھی۔ اس کے سلام کے جواب میں بولی۔

"جیو بی بی۔ خوش رہو۔ جاؤ۔ بی بی تو دیر سے تمہاری منتظر ہیں۔"

"سچی؟" ننھی سی قلقاری اس کے لبوں سے نکلی۔ اور وہ بھاگتی ہوئی اوپر پہونچی! اس کی دوست دالان میں کھڑی تھیں۔ مسکراہٹ ان کے لبوں کو چوم رہی تھی اور ہلکا نیلا لباس انھیں جاڑوں کے آسمان کا سا حسین خوشنما اور پر کشش بنا رہا تھا۔

"تسلیم!" وہ ہنس کر ان کے سامنے جھک گئی۔

"جیتی رہیے۔ ہمیشہ خوش رہیے۔" جواب ملا۔

"یہ کیا باجی۔" ٹھنک کر اس نے کہا۔ "ہمیں ملے ایک زمانہ ہوا۔ مگر آپ

ابھی تک مجھے احترام سے آپ جناب کر کے بولتی ہیں۔ جیسے میں آپ کی نا جو نہیں ہوں۔ کوئی غیر ہوں۔ آپ مجھے کتنی پیاری، کتنی اچھی لگتی ہیں۔ ویسے میں تو قربان ہو جانا چاہتی ہوں۔ مگر آپ جو مجھے آپ آپ کرکے بولتی ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ مجھے بالکل نہیں چاہتیں!۔"

نہیں تو۔" وہ ہنس کر بولیں۔" ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں تو تمہیں بہت چاہتی ہوں۔ تم اتنی پیاری سی دوست ہو میری۔ نہ جانے کس چہرہ کی شباہت ہے تم میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم میرے پاس برسوں رہی ہو۔ مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہو تم۔ میں تو تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں کہ اگر تمہاری محبت اور ہم نشینی نصیب نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔؟"

سچ باجی!۔

ہاں۔ ناجو۔ بالکل سچ!۔"

وہ جب تخت پر ٹک گئیں تو ناجیہ بھاگ کے کچن سے ایک رکابی لے آئی اور پھولا ہوا لفافہ اس میں الٹ کے رکابی ان کے سامنے کر دی۔

خدا کے لیے کھائیے باجی۔! اس نے ایک سموسہ ان کے لبوں سے لگا دیا اور مٹھی بھر کاجو بادام ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔! جب وہ کسی تکلف کے بغیر کھانے لگیں تو ناجیہ کا دل مارے مسرت کے اس قدر پھول گیا کہ سینے کی وسعتیں اس کے لیے ناکافی ہو گئیں!۔

باجی۔ یکبارگی اپنے جذبوں سے دور ہو کے وہ بولی۔" ایک بے حد ضروری بات آپ سے کہنی ہے۔ وعدہ کیجیے کہ مان لیجیے گا!۔

وعدہ کیے بغیر تمہاری ہر بات مان لوں گی۔! انہوں نے مسکرا کر کہا۔

آج امّی اور باجی کہہ رہی تھیں کہ آپ سے ملیں گی۔" اس نے کہا۔" مگر آپ کو میری جان کی قسم آپ ان سے ہرگز ہرگز نہ ملیے گا۔! اگر وہ دونوں یہاں آئیں تو آپ کسی کمرے میں چھپ کے خالہ اماں سے کہلوا دیجیے گا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔!

کیوں۔؟ وہ دل آویز انداز میں مسکرائیں۔

اد۔ باجی۔" وہ دفعتہً ان کے معطر بازو سے چمٹ گئی۔ اور اس لہجے میں بولی جیسے کہ اس کا دل پگھل رہا ہو۔" آپ کو اندازہ نہیں کہ میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھ سے اگر کہیں کہ ناجیہ تم اپنی زندگی مجھے دیدو تاکہ میں مزید سو سال اور جی لوں تو باجی میں اپنی یہ زندگی آپ کے قدموں پر نثار کر دوں۔ میں اپنی محبت میں شریک نہیں سہہ سکتی۔ اگر آپ نے امّی یا باجی سے دوستی کرلی۔ یا وہ لوگ وہ آپ کے گرویدہ ہو کر بار بار آپ کے پاس آنے لگیں۔ تب آپ صرف میری نہیں رہیں گی۔ بٹ جائیں گی۔ میری محبت کے حصّہ دار پیدا ہو جائیں گے۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں کڑھ کڑھ کے اور کھا کھا کے مر جاؤں گی۔ یا پھر غم کے مارے پچھلے کنویں میں گر کے جان دے دوں گی!

"اف فوہ۔ ایسی ہولناک باتیں نہ کرو پیاری ناجو۔" انھوں نے اس کے منتشر بالوں میں اپنی نرم نرم موی انگلیاں الجھا دیں۔" مجھے تمہاری ہر خواہش منظور ہے۔ میں تمہاری امّی اور باجی سے نہیں ملوں گی۔ کمرے میں چھپ کے کہلوا دوں گی کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ بس اب تو تم خوش ہو گئیں!

"ہاں۔ باجی۔ کیسے کہ آپ میری ہیں۔ سر سے پاؤں تک۔ آپ کی

محبت میرے لیے ہے۔ میرے سوا آپ کبھی کسی سے محبت نہیں کریں گی۔
نہیں۔ بالکل نہیں۔" اب وہ ہنس رہی تھیں۔" تم میری ہو۔ میں تمہاری ہوں۔ لیکن ناجیہ۔ محبت کو اتنا شدید نہ بناؤ کہ وہ دل کا آزار بن جائے۔ اور تمہیں کسی دوسرے کام کا نہ رکھے۔ ہر جذبہ اعتدال سے اپنانا چاہیے۔ آدمی صرف محبت ہی کرنے کے لیے تو پیدا نہیں ہوا ہے۔ کیا تم برا مان رہی ہو۔؟

بہت برا مان رہی ہوں۔" ناجیہ نے سر اٹھا کر ان کی سیاہ خوشنما آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔" دنیا کے دوسرے آدمی پیدا ہوئے ہوں گے دوسرے دوسرے کاموں کے لیے۔ مگر میں تنہا پیدا ہوئی ہوں۔ صرف آپ سے محبت کرنے کے لیے۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔"

اچھی تو تم بھی ہو، بہت ہو ناجیہ۔

تو پھر کہیے کہ آپ میری ہیں۔ میری ہی رہیں گی!۔

انہوں نے بڑے پیار سے اس کے گال پر دو انگلیوں کا ننھا سا تھپڑ لگایا۔ اور بولیں۔" بالکل بالکل۔ تمہاری ہوں۔ اور تمہاری ہی رہوں گی!۔ لیکن ننھی ناجیہ۔ تمہیں مجھ سے اتنی محبت کیوں ہو گئی ہے۔؟"

کیوں نہ ہوتی۔" برجستہ وہ بولی۔" آپ اتنی حسین ہیں، اتنی پڑھی لکھی ہیں۔ آپ تو خود ہی خاموشی کی زبان میں کہتی ہیں کہ میں چاہے جانے کے قابل ہوں۔ مجھے چاہو۔"

"یہ تو تمہاری نگاہوں کا حسن ہے ناجو۔" انہوں نے دفعتہً افسردہ انداز میں کہا۔" ورنہ آئینہ تو مجھ سے بار بار کہتا ہے کہ کسی کام کا نہیں ہے تمہارا

یہ حسن۔ کیوں کہ۔ تم ٹھکرائی جا چکی ہو ۔! "
جی۔ ؟" حیران ہو کر ناجیہ نے کہا۔"
دفعتہً جیسے وہ سنبھل گئیں۔" ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی میں اگر تمہاری نظروں سے مجھے میری دوستوں نے دیکھا ہوتا۔ چاہا ہوتا تو آج میرے آس پاس مجھ سے محبت کرنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے تا۔ تو دکھ ہونا قدرتی بات ہے۔"
سب پر لعنت بھیجئے۔! لوگوں کے سینے میں پتھر رکھے ہوتے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ جی کڑھاتی ہیں۔" ناجیہ نے دل دہی کی۔" اب میں ہوں نا سارے ناقدروں کی تلافی کر دوں گی۔"
اتنے میں موٹی خادمہ کشتی میں چائے کی پیالیاں رکھے آگئی۔ ناجیہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر ان کی خاطر اس نے چائے پی۔ اور جب اس کی لائی ہوئی چیزیں تھوڑی بہت کھا کے انہوں نے چائے پی تو ناجیہ نے سکون و مسرت کی سانس لی۔ جیسے ان کا کھایا پیا سب اسی کی حلق میں اترا ہو۔
" اچھا ناجیہ ۔" تم تب تک اخبار دیکھو۔ میں دس منٹ میں نہا کے آتی ہوں۔" انہوں نے بڑا تولیہ دروازے پر سے اتار کر کندھے پر ڈالا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔
جی اچھا۔ اس نے تندہی سے سر ہلایا۔ وہ چلی گئیں۔ تازہ اخبار میز پر پڑا تھا۔ اس کی چھوٹی بڑی سرخیاں وہ صبح ہی کو دیکھ چکی تھی۔ یوں بھی وہ اخبار پڑھنے کی شائق نہ تھی۔! اس نے دیکھا کہ میز کے اوپری خلتے پر کاہی رنگ کی مجلد ایک خوشنما کتاب رکھی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے کتاب اٹھالی۔ کہ یہ

کسی شاعر کا دیوان ہوگا ۔ مگر وہ تو بڑی قیمتی بیاض نکلی ۔ ورق الٹا تو اسے اپنی محبوب کا نام ایک گوشے میں لکھا دکھائی دیا ۔

"مدحت زہرہ ۔"

دل کش ، پر کشش ، ناجیہ کی سی جذباتی لڑکی نام ہی پر مفتون ہو گئی ۔ پھر ورق الٹے تو اشعار کی صورت میں بکھرے ہوئے جواہرات پر نظریں پڑیں ۔

تو میرے خندۂ مسرور و مطمئن پہ نہ جا
اک آرزو میرے پہلو میں سوگوار بھی ہے

صدا دیتا ہے بے آواز غم بھی
کہ خاموشی بھی آہنگ دلنوا ہے

اک ازلی التہاب اک ابدی اضطراب
مبداء فیاض سے قسمت آزادگاں

رم جھم برس رہی ہے گھٹا جی نڈھال ہے
اے یار دلنواز شب برشگال ہے

لمحہ لمحہ نفس نفس مجھ کو
تجھ سے کیا بیکراں محبت ہے

تمنّا تری ہم نشینی کی ہے
بس اک ساعتِ مختصر کے لیے

ہم طولِ مناجات سے اکتاتے نہیں ہیں
اظہارِ محبت سے فزوں تر ہو محبت!

میں سبدوں کی پیاسی، میں جھرنوں کی داسی
تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے

اے روشنیٔ دیدۂ حیران لوٹ آ
ویراں ہے دل ذہن پریشان لوٹ آ

بے نام و نشان جہاں میں جو ہے
مرجھائے گلِ دلِ بشر ہے

جو لمحے جا چکے ہیں ہم انھیں لوٹا نہیں سکتے
ہماری دسترس میں جز فغانِ نارسا کیا ہے

خوں بہا کیا شکستِ پیماں کا
زخمِ دل کا حساب کس سے لوں

اک کھویا ہوا لمحہ

خمارِ لذتِ ماضی ہے سرخوشی کیا ہے
نشاطِ رفتہ کا ماتم ہے زندگی کیا ہے

سیلِ باراں سے کبھی بجھ نہ سکے ہجر کی آگ
کیا کبھی سچ بھی نکلتے ہیں ملن کے سپنے؟

سانس لینا بھی ہے دشوار گھٹن اتنی ہے
تادمِ باز پسیں کیا یوں ہی جینا ہے مجھے

طلوعِ ازل سے غروبِ ابد تک
ہیں راہِ غمِ آرزو کا مسافر

غمِ دل کو بے نقاب نہ کر
ہنس رہیں درد مند اہلِ جہاں

لکھنے والے نے عمر بھر کے لیے
میری قسمت میں رتجگے لکھے

میری اک عمر تجھ سے وابستہ
میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں

سراپا فغاں ہے مری زندگی
تری یاد میں کس قدر تھک گئی

...

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا

ناجیہ کا حساس اور جذبوں سے معمور دل یہ اشعار پڑھ کر بے چین ہو گیا۔ ابھی وہ کچھ اور پڑھتی مگر وہ غسل سے فارغ ہو کر آ گئیں۔ اُن کے ہاتھ میں بیاض دیکھی تو مسکرا کر پوچھا "تمہیں میرا انتخاب کیسا لگا ناجیہ۔؟" وہ جواب دینا بھول گئی اور ان کا چہرہ تکنے لگی۔ کھلے ہوئے گلاب کو بھی اگر ساری رات شبنم غسل دے تب بھی شاید وہ اتنا حسین اور دل لوٹ لینے والا نہ معلوم ہوتا ہو! جناں کا چہرہ تھا۔ سیاہ الجھے ہوئے بالوں کے ہالے میں چودھویں کا چاند۔

"حسن ختم ہو گیا آپ پر۔" بے ساختہ وہ بولی۔

"میری تعریفیں تم بہت کرتی ہو۔ میں کہیں مغرور نہ ہو جاؤں۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر تولیے سے بال خشک کرنے لگیں۔ "ناجو۔ چھیالیس سال کی عمر میں کوئی عورت خوبصورت نہیں ہو سکتی!۔ خوبصورتی اور حسن کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ڈھلتی ہوئی عمر کی بدشکلی شروع ہو جاتی ہے۔ سمجھیں!۔ حسن جس کا نام ہے وہ تو تمہارے بھولے بھالے چہرہ میں پوشیدہ ہے۔ تمہارا خلوص، تمہاری محبت کی سچائی، تمہارا مجلّی کردار تمہارے چہرے کی خوبصورتی

ہے۔ بہت پیاری ہو تم۔!"

"مگر آپ سے کم۔" وہ بولی۔ اس کے پاس باتوں کا ذخیرہ کم نہ تھا۔ نجانے کیا کچھ کہہ دیتی تھی۔ جس پر وہ ہنس دیتی تھیں۔! اسے یہ بھی حیرت تھی کہ وہ اتنی زیادہ پڑھی لکھی تھیں۔ ان کا معیار بہت بلند تھا۔ اور ان کی عمر بھی اس سے دوستی کے قابل نہ تھی۔ لیکن انہوں نے برابری کا معیار برقرار رکھا تھا۔ اس کی سطحی طفلانہ باتیں دل چسپی اور دل جمعی سے سنتی تھیں۔ ان کا جواب بھی دیتی تھیں۔ وہ انہیں بہت بھولی بھالی اور معصوم سمجھتی تھی۔ جنہیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ جو مکروہات دنیا سے پاک اور ماورئی تھیں۔

میرے پاس ایک بڑی لائبریری ہے۔" اس کا ذوق دیکھ کر انہوں نے کہا۔" ویسے میں اپنی کتابیں کسی کو دیتی نہیں۔ لیکن تمہاری بات اور ہے تم جتنی کتابیں چاہو لے جاؤ۔ مگر کسی کو بتانا نہیں کہ کتابیں تم نے کہاں سے حاصل کی ہیں۔ میری بیاض ایک اور بھی ہے۔ تمہیں شعروں کی دنیا میں گم رہنا پسند ہے تو بیاض بھی لے جاؤ۔!

کون سا ادب آپ کو پسند ہے باجی۔؟" اس نے پوچھا۔ کسی نہ کسی بہانے ان کی سنہری آواز سننا چاہتی تھی۔!

ادب کی بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن رومانی ادب مجھ کو پسند نہیں۔" انہوں نے کہا۔" اب دونوں اپنے پسندیدہ چبوترہ پر حصیر بچھا کے جا بیٹھی تھیں یہاں نیم کا ایک بے حد گھنا اور سایہ دار درخت تھا۔ خوب عمدہ ہوا آتی تھی — چبوترے کے نیچے موگرے کا جھنڈ تھا۔ جس پر کھلے ہوئے پھول بکھرے تھے اور موٹی موٹی کلیاں شاخوں سے جھانک رہی تھیں۔ سامنے سرسبز باغ تھا۔

یہاں ناجیہ بیٹھ جاتی تو پھر اٹھنے کا نام نہ لیتی۔

اتنی پڑھی ہیں میں نے محبت کی کہانیاں کہ دل بھر گیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔" سب کچھ بکواس ہے۔ سلسل جھوٹ، ایک دوسرے کو فریب دینے کا طریقہ۔ سچی محبت کہاں ہوتی ہے۔ آج کل بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت کے نام پر لوگ ایکدوسرے کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔

تو پھر۔۔؟" اس نے پوچھا۔" محبت پر سے آپ کا اعتبار ختم ہو گیا۔؟

تم ہنسوگی ناجو۔ مگر اب میں جاسوسی ادب پڑھنے لگی ہوں۔" مسکراہوں نے کہا۔" تھرل، سسنی، تحیر، پر پیچ واقعات، جی لگ جاتا ہے اس میں۔"

میں تو کچھ بھی نہیں پڑھتی۔" فاتحانہ انداز میں ناجیہ نے اعلان کیا۔"

" ہاں یہ تو کہو کہ تم نے تعلیم کیوں ادھوری چھوڑ دی۔ چار پانچ روز سے میں برابر دیکھ رہی ہوں کہ تم کالج کا ناغہ کر رہی ہو۔ کیا کچھ تعطیلات ہیں۔؟"

جی نہیں!۔

تو پھر کیوں نہیں جا رہی ہیں؟"

اب پڑھنے اور امتحان دینے کا جی ہی نہیں چاہتا۔

تمہاری امی یا والد صاحب کچھ نہیں کہتے۔

کیوں نہیں کہتے۔ خوب کہتے ہیں۔" وہ ہنسی۔" مگر میں کسی کی نہیں سنتی!۔

بری بات ہے ناجیہ۔ بڑوں کا کہا ماننا چاہیے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔۔ تمہاری بھلائی ہی کے لیے تو کہتے ہیں۔ تم اتنا تو سمجھتی ہو۔!

ارے آپ کو کیا معلوم۔ جج صاحب۔ آئی مین۔ والد صاحب قبلہ۔ اپنی

بڑی صاحبزادی کو بہت چاہتے ہیں۔ ان کے بعد وہ اپنے لیے ایک بیٹا چاہتے تھے۔ مگر بیٹا نہیں ہوا۔ میں ہو گئی۔ بس والد صاحب کے دل سے اتر گئی۔ اب یہ حال ہے کہ بڑی صاحبزادی کو ایک بڑی عمدہ کار دلا دی ہے۔ ہر ماہ جیب خرچ دو ہزار دیتے ہیں۔ میں اگر دو سو بھی مانگوں تو پوچھتے ہیں کیا کام ہے۔ کیا کرو گی۔ میں رکشے پر کالج جاتی ہوں۔ ایسی توہین معلوم ہوتی ہے کہ کیا کہوں۔ بس مارے غصے کے میں بھی انہیں نہیں چاہتی۔ ان کی کوئی بات نہیں سنتی۔ اب وہ مجھے ماہر نفسیات کو دکھانے والے ہیں۔ میرے بھیجے کا کوئی پرزہ لوز ہو گیا ہے سمجھیں۔ آپ باجی!"

تم بھی تو ابو کی لاعلمی میں انہیں تنگ کرتی ہو۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی پرسوں تمہاری تفتیش کرا کے ڈیڈی کی الماری سے روپے اور امی اور بہن کی الماریوں سے قیمتی ملبوسات چرا لیے تھے۔! یہ تو تم نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔"

"بڑا نیک کام کیا باجی۔" ناجیہ نے سارا واقعہ سنایا۔ اور ہنس کر بولی "آپ کو تو پتہ ہی نہیں۔ جب امی نے اپنے شوہر کے سامنے مقدمہ رکھا تو وہ صاف بول دیئے کہ میں منصف ہوں، کوئی انسپکٹر نہیں ہوں۔ مجرم کو میرے سامنے لے آؤ، سزا دوں گا۔ تفتیش کرنا میرا کام نہیں ہے۔ اپنا سا منہ لے کے رہ گئیں۔ ان کی بیگم اور صاحبزادی۔!" اس نے قہقہہ لگایا۔

"ایسے نہیں کہتے ناجو۔ تم اپنے باپ کو اپنی امی کا شوہر کہہ رہی ہو۔" انہوں نے اپنی ہنسی ضبط کر کے کہا۔ "یعنی ان کے ساتھ ادب تمیز اور ...

نذر کیے۔ چھ سات کتابیں بھی دی تھیں۔ باغ کے نل پر بیٹھی ان کی خادمہ کپڑے دھو رہی تھی اس نے ناجیہ کو تحفتہً آم اور امرود دیئے۔ پھر بولی۔

بیٹا۔ تمہارا کوئی حرج نہ ہوتا ہو تو روز آجایا کرو۔ تمہاری وجہ سے میری بچی کا دل لگ گیا ہے۔ اس کے منہ پر ہنسی نظر آتی ہے ورنہ اداسی اور دکھ کے سوا اس کے پاس کیا تھا۔"

ارے خالہ اماں۔ اتنی سی بچی کے سامنے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ:" انھوں نے فوراً ملازمہ کو تادیب کی:" اس بچی کے دل میں خدا نے میری اتنی محبت ڈال دی ہے کہ وہ اپنی قسم بھول کے میرے پاس آجاتی ہے۔ ایسی سنجیدہ باتیں کر کے اس کا دل بھاری کرنا اچھا نہیں۔"
انھوں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔" اچھا۔ اچھو۔ اب خدا حافظ۔ مگر کالج سے لاپرواہی اچھی بات نہیں ہے۔"

مگر ملازمہ کی زبانی ان کے دکھوں کی بات سن کر ناجیہ تو پہلے ہی دلگیر اور مغموم ہو گئی تھی۔ کیا دکھ تھے انہیں۔ وہ سمجھ نہ سکی۔ بوجھل سا دل لیے چلی گئی۔ اب اُسے ان کے دکھوں کا حال جاننے کی دھن ہو گئی تھی۔

یونہی بنتا آیا ہے دستور زمانے کا یہ دنیا ازل سے یونہی غمزدہ ہے

اب گھر کی صورتِ حال یہ تھی کہ جج صاحب، بیگم سلمیٰ اور عذرا بالکل ہی لاتعلق ہو گئی تھیں۔ جج صاحب نے اپنی بزرگ بوا کو بھی منع کر دیا تھا کہ ناجیہ کے پیچھے نہ پڑیں وہ سب کی نصیحتوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ ضدی اور سرکش ہوتی جا رہی تھی یوں

بیٹی نے بھی مناسب سمجھا کہ ان ہی کا کہا کر دیں ۔ اور پھر اندازہ کریں کہ نتیجہ کار و یکیا ہوتا ہے۔ لیکن بڑھی بہتّر برس کی دادی جو تھیں تو جج صاحب کی کھلائی اور ان کے والد کے زمانہ کی خادمہ جو اب اپنی قدامت اور اہمیت کے مارے گھر بھر کی بزرگ اور اہم ترین فرد بن چکی تھیں ۔ دیدے نکال کے جج صاحب پر جیسے ڈھ ہی گئیں ۔

" کیا اچھا انصاف کر رہے ہو میاں ۔ واہ واہ ۔ مطلب تمہارا یہ ہے کہ لڑکی کے بڑے بوڑھوں ہی گونڈ لگا دیں ۔ اسے من مانی کرنے دیں ۔ ہار جائیں ، بالش بھر کی لڑکی سے ۔ اسے کچھ نہ کہیں ۔ کیا تم اسے بڑی تجربہ کار ، سوجھ بوجھ والی کوئی سنجیدہ عورت سمجھتے ہو ۔ سوچو میاں کہ اس کی بساط کیا ہے ۔ اس کی عقل کتنی ہے ، عمر کیا ہے ۔ اسے یوں بے مہار چھوڑ دینا عقلمندی نہیں میاں ۔ پھر تمہاری مرضی ۔ اولاد تمہاری ہے ۔ جو چاہو کرو ۔ میں کون ہوتی ہوں ۔"

جج صاحب ان کی زبان اور لیکچر سے بے حد گھبراتے تھے ۔ اور ان کے خاموش ہونے کی دعا مانگتے رہتے تھے ۔ چنانچہ ان کے خاموش ہوتے ہی بولے ۔

" کب کہا میں نے کہ آپ کسی کی کیوں نہیں ہوتیں ۔ ہم سب آپ کو اپنا بزرگ مانتے ہیں لیکن میں یہ کہہ رہا تھا اماں کہ بات کرنے کا ایک وقت اور طریقہ ہوتا ہے اور معاف کیجیے گا آپ جو بہت پرانے زمانے اور پرانے خیالات کی خاتون ہیں ۔ اور قدیم رہن سہن آپ کو پسند بھی ہے جو والد مرحوم اور آپا مرحومہ کا تھا ۔ لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے ۔ اور آج کل کے بچوں کا ذہن اور ہے ۔ رہن سہن اور ہے ۔ وہ قدیم خیالوں کو اپنا نہیں سکتے ۔ الجھتے ہیں اور جواب دینے لگتے ہیں جس سے بڑوں کو رنج پہنچتا ہے ۔ اور مسلسل کہنے سننے سے ان میں ضد اور ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے ۔ لہٰذا میں

یہ کہنا چاہتا تھا کہ ایک مختصر سے عرصے کے لیے (مجھ سے کچھ نہ کہیں)۔ وہ اپنی ضد اور خود سری خود بخود چھوڑ دے گی۔! آپ سمجھیں۔؟"

"نہیں سمجھی میاں۔" منہ پھلا کر انہوں نے جواب دیا۔ "کون سا طریقہ ہے یہ تربیت کا کہ اپنے پیٹ کی اولاد کو اس کے حالوں پر چھوڑ دو۔ ہمارے زمانے کی بات دیکھو کہ بس دس سال کی تھی۔ اماں نے منع کر دیا تھا کہ نیم تلے اس پار کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلا کرو ان کی بات نہیں مانی میں نے۔ بس ایک دفعہ نیم تلے سے چوٹی پکڑ کے گھسیٹتی ہوئی لائیں اور چمچی اٹھا کے چار چوٹ کی ایسی مار ماری کہ آج تک یاد ہے موئی وہ مار۔!"

جج صاحب ہنسنے لگے۔ "اب میں اسے مار تو نہیں سکتا نا اماں۔ آپ بھی یہ نہیں چاہتیں کہ اسے مارا پیٹا جائے! لیکن وہ کرتی کیا ہے صرف تھوڑی سی شرارت اور ضد اس عمر میں کون نہیں ہوتا۔ دو تین سال میں عقل آئے گی۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"مجھے تو ہول چھوٹ گئیں میاں۔ جب میں نے پرسوں دیکھا کہ ۔۔"

"کیا دیکھا؟ ۔۔" جج صاحب چونکے اور بیگم اور عذرا بھی بڑی بی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"نہیں میاں، میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔" وہ بولیں۔ "پہلے ہی وہ مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے میری زبان سے اگر کچھ نکل جائے گا تو وہ مجھے گھر سے نکالنے پر تل جائے گی۔"

"تو لیجیے۔ اماں، کیا کوئی نئی شرارت کی ہے اس نے۔؟" بیگم نے پوچھا۔

بلاؤ ننھو کی ماں کو۔ اس سے پوچھو۔ میں کیا جانوں۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ چنانچہ ملازمہ ننھو کی ماں کو طلب کیا گیا! وہ بے چاری کانپ رہی تھی۔ اور اس گھر کے ہر مکین کے سامنے جاتے ڈرتی تھی۔ کیوں کہ یہاں سب ہی غصہ ور، اور تیز مزاج تھے۔

کیا کیا پرسوں ناجیہ نے۔؟" بیگم نے پوچھا۔ "کہیں بی بی نے شرارت کی تھی کیا۔؟

جی نہیں۔" وہ باری باری سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "پرسوں تو ایک آدھ گھنٹے تک چھوٹی سرکار ایک صاحبزادے سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کے لیے دال ہی لسک لے کے میں ہی تو گئی تھی۔ پھر جب وہ میاں گئے تو چھوٹی بی باغ سے گزر کر اونچی دیوار والے گھر میں چلی گئیں۔ شرارت تو انہوں نے کوئی نہیں کی سرکار۔"

اچھا۔ تم جاؤ۔! عذرا بولی۔ وہ چلی گئی۔

صاحبزادے!" بیگم نے طنز یہ کہا۔ "پہونچ گئی کسی صاحبزادے تک نوبت خدا ہی اب خیر کرے!۔

کہاں ہے ناجیہ!۔" جج صاحب کو بھی پریشانی ہوئی۔

کالج گئی ہے!۔ عذرا نے جواب دیا۔

آج نو ہی بجے چلی گئی۔" جج صاحب بولے: "اتنے دن کالج سے غیر حاضر کیوں رہی تھی۔

کالج گئی بھی ہے کہ پہونچ گئی ہے ہمسائے میں۔ بیگم نے پُر نفرت انداز میں کہا۔"

نہ جانے کون عورت آ کے بسی ہے پرلی طرف کہ ناجیہ کا دماغ الٹ کے رکھ دیا ہے۔ دن رات ان کے حسن کے قصیدے پڑھتی ہے ان کی علمیت کے گن گاتی ہے۔ ہر وقت زبان پر بس باجی جان کا وظیفہ رہتا ہے۔ میں تو خوفزدہ ہوں۔ کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں ہے۔ لے کے فرار ہو جائے اس پاگل کو۔ بزاری عورتیں خوبصورت ناسمجھ بچیوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ انہیں تباہ و برباد کرتی ہیں۔ اپنی تجوریاں بھرتی ہیں۔

جج صاحب جو ٹہل رہے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر غفورا کی طرف مڑے اور بولے۔ "تم فوراً کالج جاؤ اور دیکھو کہ ناجیہ کالج میں ہے کہ نہیں۔ اور بیگم تم ذرا ہمسائے میں دیکھو کہ وہ وہاں تو نہیں ہے یہ معلوم کرتی آنا کہ وہ محترمہ جو ہمسائے میں آ کے رہی ہیں کیسی ہیں۔ ان کا رہن سہن کیسا ہے۔ گفتگو کا قرینہ کیا ہے جاؤ تم دونوں فوراً۔ میں گیارہ بجے تک گھر پر رہوں گا۔ اور تمہارا منتظر رہوں گا۔ جاؤ!۔" دونوں اپنے مشن پر روانہ ہو گئیں۔

وہ متفکر اور پریشان سے باہر جا کے بیٹھ گئے۔ اور سوچنے لگے کہ مسئلہ بن گئی تھی سترہ سال کی لڑکی۔ کیا وہ کسی صاحبزادے میں اس عمر میں دلچسپی لینے لگی تھی ان کا دماغ سن ہوا جا رہا تھا!۔ وہ اٹھے اور برآمدے میں جا کھڑے ہوئے ہکتی بکتی ان کی نظریں باغ کی محدود وسعتوں سے سمٹ کر اس بلند اور کاہی زدہ دیوار سے ٹکرائیں!۔ ایک ہوک سی دل سے اور آہ بن کر لبوں پر دم توڑ گئی۔ ذہن نے پلٹا کھایا۔ کچیس سال پہلے کی دنیا میں چھلانگ لگائی تھی۔ یکبارگی بہت کچھ یاد

آ گیا تھا۔ ان کے بارعب اور باوقار چہرے پر ندامت و خجالت کے ساتھ ساتھ حسرت و حرماں کی سرخی بھی پھیل گئی تھی! کچھ دیر کھڑے وہ اس دیوار کو تکتے رہے۔ جیسے اس پر ان کی زندگی کی کوئی ادھوری کہانی لکھی تھی جس کے الفاظ اور جس کی سطریں کچھ برساتوں نے میٹ دی تھیں۔

وہ پھر کمرے میں واپس آ گئے۔ اور صوفہ پر بیٹھ کر بڑھا ہوا اخبار پھر اٹھا لیا۔ کہیں جی نہیں لگ رہا تھا۔ دل بےچین تھا، دماغ الجھا ہوا تھا۔ بہت کچھ سوچنے کو تھا اور سوچنے سے وحشت ہو رہی تھی۔ فی الحال تو ناجیہ ہی ان کے ہوش کھونے کو کم نہ تھی۔ انہوں نے دیوار گیر کلاک کو دیکھا۔ پھر کٹ سے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ان میں دونوں دس بج رہے تھے۔

وقت جم کے رہ گیا ہے ایک جگہ پر۔ نہ جانے وہ دونوں کب آئیں گی!

دروازے سے پرانے ملازم خان صاحب نے پوچھا۔

"سرکار، چائے، کافی کچھ لاؤں۔؟"

نہیں" انہوں نے کہا۔ اور دیوان پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وقت کی برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ گھڑی نے گیارہ بجنے کا اعلان کیا۔ وہ چونک کے بیدار ہو گئے۔ اور اندر پہنچے! بیوی اور بیٹی آ چکی تھیں۔ ان کی مستفسرانہ نظروں کے جواب میں عذرا بولیں۔

میں کالج گئی تھی ڈیڈی۔ ناجیہ موجود تھی کلاس میں۔ مجھے دیکھ کر اسے غصہ آ گیا۔ بولی تھی کہ کیا میری جاسوسی کرنے آئی ہیں۔ اس کے ساتھی ہنسنے لگے تھے۔ اور لیکچرز نے بھی مجھے شبہ کی نظروں سے گھورا تھا! وہ بڑا سا

منہ بنا کر چپ ہو گئیں۔

میں تو بڑی دیر ہوئی آگئی تھی۔" بیگم نے اپنی رپورٹ پیش کی۔" آپ تو دیکھا کر سو گئے۔ سوچا جگایا نہیں۔

کیا ہوا۔ تم ملیں ان محترمہ سے! جج صاحب نے پوچھا۔

ان کی ملازمہ سے ایک دو باتیں ہوئیں۔ وہ محترمہ تو نہیں ملیں۔ ملازمہ نے بتایا کہ ان کے بھائی آئے ہیں اور زخمی ہیں کہ بیگم صاحب کچھ خریدنے بازار گئی ہیں۔ اور دو تین گھنٹوں بعد آئیں گی۔ میں ٹھہر کے کیا کرتی۔ آگئی واپس۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہم سائے کی وہ خاتون کوئی ایسی ویسی نہیں ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے تو تم ہی کہہ رہی تھیں کہ ——

جج صاحب کی بات بیگم نے کاٹ دی۔ ہاں پریشانی میں سوچ لیا تھا۔ اب۔ اب خیال بدل گیا ہے۔ کیونکہ ان کی وہ بچاری کم ملازمہ ہی ایسی مہذب تھی اور تمیز سے گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ہال کی دیوار پر ایک تصویر لگی دیکھی تھی کیا بتاؤں۔ کیسا حسین چہرہ تھا۔ اگر وہی ہیں اس گھر کی مالکن تو اتنا چہرہ درست تو پھر تشویش اور پریشانی کی کوئی بات نہیں!"

"ارے صاحبزادے کو تم کیوں بھول رہی ہو۔ جو غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ اور نامہ کو شرفت بزبانی بخشا تھا!" جج صاحب نے کہا۔

ارے ہاں۔ وہ صاحبزادے! دھک سے رہ کر بیگم صاحب نے کہا۔ پتہ نہیں مجھے بھول کیسے گئی تھیں۔ اب دیکھنا جب آئے تو پوچھوں!

ہو گا اس کا کوئی کلاس فیلو۔" جج صاحب نے کہا۔ پھر بولے۔ "خیر۔ دو طرف سے
تو اطمینان ہو گیا۔ صاحبزادے کا قصہ بھی یوں ہی سا نکلے گا۔ مگر لا حول ولا قوۃ گھر کی
بڑی بوڑھیاں رائی کا کیسا پہاڑ بناتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو میں بھی پریشان ہو گیا
تھا۔ اچھا بھئی۔ میں اب چلتا ہوں۔ یوں ہی بڑی دیر ہو گئی ہے۔ رات کو ایک
بیرسٹر صاحب کے ہاں ڈنر پر مدعو ہوں۔ کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ملازم کو آواز دی۔ "غلام جیلانی سے کہو۔ گاڑی نکالے۔"
اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

ایک دن عذرا نے چپکے سے بیگم سے کہا۔ "سچ مچ امی اس بڑھی کو گھر سے نکال دیجیے
کہیں اپنے بیٹوں کے پاس گاؤں چلی جائے۔ اس نے واقعی ناجیہ کا جینا حرام
کر رکھا ہے۔ کل شام کو اس کے سر ہو رہی تھی کہ تیل اٹھا لاؤ۔ میں لگا کے خوب تنگ
چوٹی گوندھ دوں۔ بھلا آج کل کوئی لڑکی ایسی چوٹی گوندھتی ہے۔ مذاق نہ بن جائے
گا۔ جب ناجیہ بولی۔ مجھے تیل لگانا اور چوٹی گندھوانا نہیں ہے تو پورے ایک گھنٹے
تک اس کے پیچھے پڑی رہیں، ضد اور اس کی ناقص تربیت پر لیکچر دیا تھا۔ وہ تو وہ میں
خود بیزار آ گئی تھی۔"

"ارے بیٹی وہ تو ساس بن کے رہ گئی ہیں۔" بیگم نے کہا۔ "میں تو ان کے منہ ہی
نہیں لگتی۔ بس بات چیت کی منافقت کرتی ہوں۔ تمہارے دادا کے زمانے
کی ہیں، تمہارے ڈیڈی تو انہیں ماں کے برابر سمجھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے
ہیں۔ میری بھلا کیا مجال ہے کہ میں انہیں گھر سے نکالوں۔ تمہارے بابا جان

مجھے گھر سے نکال نہ دیں گے۔"

امی کچھ پتہ چلا۔ روپے اور ہمارے کپڑے کس نے چرائے۔ کیا کیے۔؟
نہیں بیٹی۔ نہ جانے کون شیطان پھیر اگر گیا تھا۔ اب کیا ملیں گے روپے
اور کپڑے۔ صبر کرلو۔!"

کچھ دیر دونوں وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں عذرا کا ریسرچ پریکٹ ایک
بجے شروع ہوتا تھا۔ ان کے پیر واٹر صاحب بھی تبھی آتے تھے۔ لہٰذا عذرا نے
تیار ہوکر یونیورسٹی کی راہ لی۔ بیگم کے پاس اتفاقاً ان کی ایک رشتہ دار آئیں۔ وہ
باتیں کرنے لگیں! آج انہیں کہیں جانا نہیں تھا۔ ان کی آمد سے خوش ہوگئیں۔

عورتوں کی دلچسپی کا موضوع تو شادی بیاہ کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ جج صاحب
کی ان بہن کو معلوم تھا کہ عذرا کی منگنی ہو چکی تھی۔ اور ان کے منگیتر کے آنے کے
بعد ان کی شادی میں بھی دیر نہ لگے گی! چنانچہ انھوں نے نادیہ کو موضوع بنا لیا۔

"مصطفیٰ بھائی ایک دن ہمارے یہاں آئے تھے۔ بچے تذکرہ تمہاری بھتیجیوں
کا نکلا تو کہہ رہے تھے کہ عذرا کی طرف سے بے فکری ہے۔ لیکن نادیہ کے قابل خاندان
بھر میں کوئی لڑکا نہیں۔ اے میں کہتی ہوں بی بی۔ کیا تم کمال احمد کو بھول گئی ہو۔ تمہارا
دیکھا بھالا ہے۔ اسی سال اس نے ایم۔ اے کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد کسی کالج میں
لیکچرر ہو جائے گا!۔ اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں! کیا وہ نادیہ کے
قابل نہیں ہے۔ بہت سے بہت چھ سات برس بڑا ہوگا تمہاری لڑکی سے۔ اور کیا۔؟
میرا بس چلے تو خدیجہ میں آج دونوں کے ہاتھ پیلے کردوں۔" بیگم کیا۔ مگر

اس گھر میں میری کچھ چلتی بھی ہے ۔ وہ تو ابھی عذرا ہی کی شادی کے مخالف تھے ۔ یہ تو میں نے ہی عفان کو اچھا لڑکا دیکھ کر منگنی کر دی ہے ۔ اب وہ بھلا ناجیہ کے بارے میں کہاں راضی ہوں گے ۔ ان کے نزدیک ابھی تو وہ انگوٹھا چوس رہی ہے ۔ ہُنھہ ! ۔ "

ہاں ابھی تو وہ سچ مچ بچی ہے ۔" خدیجہ نے کہا " پڑھ رہی ہے ۔ آج کل وہ زمانہ نہیں ہے کہ سولہ سترہ سال کی لڑکی پہاڑ بن کے کلیجے پر آ بیٹھتی تھی ۔ اور ماں باپ اسکے بڑے ہونے کا انتظار کیے بغیر نو دس سال کی عمر میں سسرال کی کر دیتے تھے ۔ اب تو تیس تیس سال کی عورتیں لڑکیاں کہلاتی ہیں ۔ گھر ہی میں نگوڑیوں کے بال سفید ہو جاتے ہیں ۔ مگر میں یہ کہہ رہی تھی سلمیٰ کہ آخر خدا رکھے ناجیہ کی بات کہیں نہ کہیں تو ہو گی نا ۔ تب میرے کمال کو بھول نہ جانا تم ۔ !

میں تو خیر نہیں بھولوں گی مگر یہ بات اپنے بھائی سے تم ہی کہو ۔ میں ذکر بھی کروں گی تو وہ مجھے پاگل بنا دیں گے ۔ کہہ چکے ہیں کہ کم سنی میں اپنی لڑکیاں نہیں بیاہوں گا ۔ وہ بات کہہ کے پھرنے والے تھوڑی ہیں ! پتھر کی لکیر ۔ بس ،

وہ ہنسنے لگیں " ہاں ہاں مصطفیٰ بھائی سے میں تذکرہ کروں گی ۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہاری یہ بچی ہے بہت پیاری سی ۔ مجھے شروع سے اچھی لگتی ہے ۔ چاہتی ہوں کہ اپنی بچی بنا کے کلیجے میں رکھ لوں ۔ ترستی ہوں ایک بچی کے لیے ۔ مالک نے بیٹے دیے بیٹی ایک دی ۔ اللہ کی رحمت اترتی گھر میں ! "

معاف رکھو ۔ آج کل بیٹیاں اللہ کی رحمت بن کر گھر میں نہیں اترتیں ۔ جان کا عذاب جی کا جنجال بن کے نازل ہوتی ہیں ۔ دیکھ نہیں رہی ہو آج کے زمانے کے حالات

اور جہیز کے لالچ میں بھیک منگے لڑکے منہ پھیلائے، جھولی پسارے بیٹھے ہیں۔ ماتے ہی نہیں۔
بے حیاؤں کو نقد رقم بھی دو۔ لاری بھر جہیز دو۔ اور ساتھ میں مٹی کا تیل اور ماچس بھی پکڑا دو
کہ بھیّا اگر تمہاری بیوی اور ہماری نصیبوں ماری بیٹی کوئی چیز لانا بھول گئی ہے اور تمہارا
مطالبہ پورا نہیں کر رہی ہے تو پھر تو تیل اور آگ لگا دو۔! کتنی لڑکیاں جہیز اور نقد
رقم کے نہ ہونے سے باپ کا در پکڑے بیٹھی ہیں۔ اس لیے بہن اس زمانے کی
کسی لڑکی کو رحمت نہ کہو۔

کہتی تو سچ ہو۔ مگر بعض جگہ لڑکیاں راج بھی کر رہی ہیں۔ اگر سارے ہی سسرال
والے ایسے بے بد ہو جائیں تو ایک اندھیر مچ جائے دنیا میں۔ یہ تو نہایت ذلیل کمینے
بے شرم مردوں کا وطیرہ ہے کہ سدا کشکول لیے بیوی کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں
یا بیویوں کو زندہ جلا دیتے ہیں۔ اب دیکھو۔ ہم تم راج کر رہے ہیں کہ نہیں۔
میاؤں نے دنیا کا سارا سکھ دے رکھا ہے۔

اپنی تو مثال ہی نہ دو۔ نہ میرے میاں نے میرے باپ سے کانی کوڑی کا مطالبہ کیا
نہ جہیز کا نام زبان پر لائے۔ انہیں تو شاید معلوم ہی نہ تھا کہ ہونے والے سسر سے
نقد رقم اور جہیز کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ ابا جان نے خود ہی ان
کا لباس سلوا کے بھجوا دیا تھا۔ نکاح کے دن وہی پہن کے چلے آئے تھے۔
اور مارے عقیدت کے برسوں تک اس لباس کو سینت کے رکھا تھا کہ محترم خسر صاحب کا عطیہ ہے۔

قہقہہ لگا کر خدیجہ بیگم نے کہا۔ "بالکل ایسا ہی کمال کے ابا کے ساتھ ہوا۔ نہ نقد
رقم نہ نگوڑا جہیز۔ جو کچھ اماں مرحوم نے دیا۔ لے کے چلے آئے۔ میں تو جانوں کہ

میرا معمولی جہیز انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔

کاش وہ زمانہ پھر زمانہ پھر پلٹ آئے کہ مرد صحیح معنوں میں خود کو مرد سمجھیں۔ خود دار آن پرست، غیور اور غنی۔ مرد آخر کہتے کسے ہیں۔ جس کا ظرف بڑا ہوتا ہے۔ جو وسیع النظر روشن خیال ہوتا ہے۔ بیوی کے پیسے پر اکڑنے والوں کو میں مرد نہیں کہہ سکتی۔ جو اپنی محنت و مشقت کی چکتی ہوئی روٹی کھانے کے بجائے بیوی کے گھر کے تر تراتے پراٹھے کھانے بے غیرتی نے مجبور کر رکھا دیتے پھرتے ہیں ان پر خدا کی مار!۔

ایسا ظالمانہ چلن بس اللہ ہی روکے تو رکے گا۔" خدیجہ بیگم نے کہا۔" ورنہ یہ وبا اور کہاں تک پھیلے گی یہ بھی خدا ہی جانے۔ اس مرض کا بس یہی علاج ہے کہ لڑکی والے روپیہ پیسہ اور جہیز قطعی نہ دیں۔ بس یہ چلن آپ ہی آپ رک جائیگا۔

کبھی نہ رکے گا!" بیگم بولیں۔" ماں باپ بے چارے سمجھنے لگے ہیں۔ لڑکی کے ساتھ لاؤ لشکر نہ دیا جائے گا۔ لڑکی سسرال میں خوش نہ رہ سکے گی۔ اور ا والے سمجھ بیٹھے ہیں کہ سسرال سے گھسیٹنا ان کا حق ہے! ۔ لہٰذا ۔۔"

ہے دوسری بات بھی ۔ ہے کہ بے روزگاری حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔" خدیجہ نے کہا بیٹے تو یہ ہوتا تھا۔ پڑھا لکھا ایک شخص آسانی سے سرکاری ملازمت تلاش کر لا ۔ اب یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد زیادہ ہے۔ اور ملازمت صرف ایک سے ملتی ہے۔ ضروریات زندگی رکتی نہیں۔ روٹی کپڑا اور ایک گھر ہی پر معاملہ ختم نہیں ہوتا۔ شادی بیاہ، بیماری دکھ، غرض دنیا سب ہی کچھ انسان کی جان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ بس نہیں ہے۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا۔ دوسرے در پر ہاتھ پھیلانا ہی پڑتا ہے۔

ننگے مر تو نہیں سکتے۔!

ارے جائز تو شریفانہ مطالبہ کریں تو کوئی مان بھی لے۔ یہ بہوؤں پر مٹی کا تیل چھڑک کے دیا سلائی دکھا دینا کہاں کی انسانیت ہے!۔"

ہاں۔ یہ البتہ بڑی بیدردی اور سنگدلی ہے۔!"۔

ٹھنڈی سانس لے کر بیگم سلمیٰ نے کہا۔ "پھر وہی بات آپڑتی ہے۔ زمانے کے ساتھ چلنے کی۔ زر نقد اور اناودں جہیز دینے کی مخالف میں بھی ہوں، مگر جوڑ رکھا ہے پیسہ کوڑی اور جہیز بھی صرف اسی لیے کہ لڑکی سسرال میں طعنے تشنے۔ وہاں تو مسالینت کی دوڑ بھی ہوتی ہے۔ پہلی بہو کوٹھی کار لائی۔ دوسری بہو کو نصیب نہ ہوئی لہٰذا مرتے دم تک بیچاری احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ یا زندہ جل مرے، شہادت کا درجہ پائے۔!"

اچھا۔ مگر میری بات گرہ میں باندھ لو کہ ناجیہ کو کچھ نہ دینا۔" خدیجہ بیگم ہنس کر بولیں۔ میرا مطالبہ خدانخواستہ کچھ نہیں ہے۔

"اللہ مالک ہے۔ اس کے نصیب کا جو کچھ ہوگا وہ تو اسے ملے گا ہی۔"

کب آرہے ہیں تمہارے داماد صاحب۔ کیا ابھی پڑھائی ختم نہیں ہوئی!" خدیجہ بیگم نے اکتا کر موضوع بدل دیا۔

بھاوج بتا رہی تھیں کہ جلد ہی آنے والے ہیں۔" بیگم نے کہا: "شادی کی غرض سے آئیں گے اور مہینہ بھر رہ کے بیوی سمیت پھر چلے جائیں گے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"جرمنی میں ہیں۔ عفان میاں۔؟"

"ہاں۔" بیگم نے کہا: اور ملازمہ کو آواز دی کہ بینچ کا انتظام کرے۔

اعجازِ مسیحا کی بڑی بات ہے لیکن یارب کہیں بربادیٔ دل کی بھی دوا ہے

ناجیہ نے اپنی باجی جان کی تاکید پر مارے باندھے کالج جانا شروع کیا تھا مگر وہاں اس کا دل قطعی نہ لگتا۔ چونکہ اس کی سی خوبصورت اور عالم فاضل خاتون کا حکم ماننا اس کا ایمان تھا۔ لہٰذا مجبوراً کالج لگی تھی۔ وہاں بیزار اور اکتائی ہوئی بیٹھی رہی۔ سُنا ہی نہیں کہ لیکچرر صاحبات کیا پڑھا کے چلے گئے۔ سبق کیا تھا۔ نوٹس کیا لکھائے۔ وہ سارے حواس سے عاری تھی۔ ٹک ٹک لیکچراروں کی بے رنگ معمولی سی شکلیں تکتی رہی۔ ان کے لبوں کی جنبش دیکھتی رہی۔ اور خالی وقت میں کتابوں کے حاشیہ پر خوبصورت آنکھیں اور خوشنما ہونٹوں کی تصویریں بنایا کی!۔ دن کے نو بجے سے دوپہر کا ایک بجنا قیامت ہو گیا! ایسا پہاڑ سا دن وقت تو اس کی زندگی میں کبھی آیا ہی نہ تھا۔ بے چینی سے منتظر تھی کہ ایک بجے اور وہ اپنی محبوب کے پاس بھاگے۔! اس کے ذہن میں نیم کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور آنکھوں کے سامنے ان کا حسین چہرہ مسکرا رہا تھا۔ مگر ابھی گیارہ ہی بجے تھے۔

نہ جانے پڑھائی کا چلن پہلے پہل نکالا کس نے تھا۔! دانت پیس کر اس نے سوچا۔ پہلے کے لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ پتے باندھتے تھے۔ اور مزے میں زندگی گزارتے تھے۔ انھیں پڑھائی لکھائی کی ضرورت تھی۔ کیا وہ زندہ نہیں رہتے تھے۔ وہ بس سوچے جا رہی تھی تبھی ایک بات بڑی عجیب سی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بڑی بہن عذرا ایک لیکچرر کے ساتھ اس کے کلاس میں آئی تھیں۔ اس پر اور اس کے سارے ساتھیوں پر ایک اُڑتی نظر ڈالی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اسی کی جاسوسی کی خاطر انہیں بھیجا گیا تھا۔ بس،

اس کا بھیجہ سنسنا گیا۔ اس نے بے ارادہ کہہ ہی دیا۔

"آپ میری جاسوسی کرنے نہیں آئیں کیا۔ جا کے اپنے والدین سے کہہ دیجئے کہ میں کہیں اور ہٹ گئی۔ کالج بھی آتی ہوں ۔۔۔"

لڑکے لڑکیوں میں مدھم سی ہنسی کا ملا جلا شور ابھرا تھا۔ اور نوٹس دینے والے لیکچرر صاحب عذرا کو ناگواری سے گھورنے لگے تھے۔ عذرا کو غصہ ضبط کر کے کلاس سے بھاگنا پڑا۔ اس کا موڈ تو زہر آلود ہو ہی گیا تھا۔ مگر نا جیہ کا موڈ طوفانی ہو گیا۔! وہ تو مرنے مارنے پر تل گئی تھی۔ اور گھر جانے کے بجائے کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ عذرا کے جانے کے بعد وہ کلاس میں نہ بیٹھ سکی۔ پہلے ہی بیزار ہو رہی تھی حالانکہ ابھی کالج کا بہت سا وقت باقی تھا۔ مگر وہ اٹھ گئی۔

اس کے لیے راتب کا رکشہ مقرر تھا! لیکن آج اس نے نوزماں کا بھی انتظار نہ کیا۔ ایک رکشہ کرایہ کا ٹھہرایا اور چل پڑی اپنی منزل کی طرف۔ جیسے جیسے رکشہ آگے بڑھ رہا تھا اس کا دل اس کلی کے مانند کھل رہا تھا جس پر ہلکی ہلکی شبنم گرے۔ ہونٹ مسکرانے لگے تھے۔ سینے میں انجانے جذبے ہلچل مچا رہے لگے تھے۔ ایک سرمستی اور بیخودی تھی جو اس پر طاری تھی! سر ہلا کر وہ مسکرائی۔ اور گنگنانے لگی :

مانیے کہ مانیے مگر خدا کی قسم ہے

لمحہ لمحہ، نفس نفس مجھ کو

تجھ سے کیا بیکراں محبت ہے

رکشہ بالآخر گیٹ پر رک گیا! اس نے دیکھے بھالے بغیر ایک نوٹ پرس سے نکالا اور رکشے
والے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر ذیلی کھڑکی سے داخل ہو کر روش پر بھاگتی چلی گئی۔
گھر بھر میں سناٹا پڑا تھا۔
اس کی باجی جان گھر میں نہیں تھیں۔ ناجیہ کے دہکتے ہوئے ولولوں پر اوس کی برف
پڑ گئی۔
خالہ اماں۔ کہاں گئیں باجی جان؟" اس نے خالہ اماں سے پوچھا۔
خالہ اماں، دالان کی دہلیز پر بیٹھی پان کھا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک مشفقانہ مسکراہٹ
ان کے دبیز لبوں پر نمودار ہو گئی۔
"کچھ خریدنے بازار گئی ہیں۔ آتی ہوں گی تم بیٹھو بیٹی۔!"
وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ سانچی کا ٹوپ نما خالہ اماں بھی اسے سگ لیلیٰ کی سی پیاری
تھیں۔ کیونکہ اس کی محبوب سے وابستہ تھیں۔
"بیٹا سنو۔" وہ بولیں "کچھ دیر پہلے ایک گوری گوری میم صاحب کی سی خاتون تمہیں پوچھنے
یہاں آئی تھیں۔ جب میں نے بتایا کہ تم یہاں نہیں آئی ہو۔ تو تمہاری باجی کو پوچھنے لگیں۔
ان سے ملنا چاہتی تھیں۔ اتفاق سے وہ بھی گھر میں نہیں تھیں۔ برا سا منہ بنا کر گئی
تھیں وہ! کون ہیں بیٹی وہ! کیا کام انہیں تم سے اور ان سے۔"
ناجیہ سلگ اٹھی۔
خالہ اماں۔ وہ میم صاحبہ میری والدہ محترمہ ہیں۔" بھنا کر اور جل کر ناجیہ بولی "سمجھ میں نہیں
آرہا کہ آخر میرے ماں باپ اور بہن کو مجھ پر کس بات کا شبہ ہو گیا ہے کہ میری جاسوسی کرتی پھرتی

ہیں وہ۔ اچھا ہوا کہ وہ باجی سے نہ مل سکیں معلوم نہیں، کیا باتیں کرتیں۔ اور اپنی لستعلیق گفتگو سے متاثر کر کے انہیں اپنی طرف کر لیتیں امی پروفیسر ہیں نا۔ باتیں کرنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا ہے۔ میری باجی اتنی معصوم سی بھولی بھالی ہیں ان کی باتوں میں آجاتیں تو کیا ہوتا خالہ اماں میں تو مر جاتی اگر باجی سے سلوک میں بیے ذرا سی بھی تبدیلی کر دیتیں۔

تم کتنے بہن بھائی ہو بھی۔؟

بھائی : ناجیہ نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔" مجھ سے بڑی ایک بہن ہیں اور میں ہوں بس۔

"اور بھی رشتہ دار ہوں گے۔؟"

امی کے والدین اور میرے دادی دادا تو گزر گئے۔ خالائیں، چچا، پھوپھیاں ہیں۔ آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں۔ لیکن مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔

کیوں۔؟ ایک چٹکی ناجیہ کو گال میں دبا کے مسکرا کے انہوں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیوں خالہ اماں۔ امی کے عزیز ہوں چاہے ابا کے۔ مجھے سب کے سب کچھ عجیب سے مصنوعی اور بناوٹی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں خلوص و محبت، بے لوثی کا شائبہ بھی مجھے نظر نہیں آتا۔ بن بن کے باتیں کرنا۔ جان بوجھ کے مسکرانا اور خواہ مخواہ ہنسنا۔ ادائیں دکھانا مجھے پسند نہیں۔ خالہ اماں۔ اس لیے جب والدین کا کوئی عزیز آتا ہے میں باغ میں مالی دادا کی کوٹھری میں چھپ کے بیٹھ جاتی ہوں۔"

ہاں آدمی کھلے دل سے باتیں کرے۔ اور صاف دلی سے ہنسے تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔" خالہ اماں نے کہا۔" پھر بولیں۔ تم دیر کی آئی بیٹھی ہو میں تمہارے لیے

جائے۔ نراتی ہوں! ــ

باجی کے آنے کے بعد بیٹیں گے۔" ناجیہ نے کہا: "مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ آپ کے یہاں کیا پکا ہے ــ؟

مصالحہ اور گوشت ہے۔ خرفہ کا ساگ، بڑی دال اور چاول۔ اب بی بی کھانے بیٹھیں گی تو گرم گرم پھلکے ڈلوا دوں گی! کیوں ــ؟

ناجیہ ہنسی اور اپنے پرس سے اٹھ کر ایک ڈبہ نکال کر بڑی بی کو دیتی ہوئی بولی: "صبح ناشتے میں باجی صاحبہ نے شامی کباب بنوائے تھے۔ وہ اُدھر نہانے گئیں اِدھر میں نے آدھے سے زیادہ چرا کر ڈبے میں رکھ لیے۔ اپنی باجی کے لیے۔ آپ کہیے گا نہیں، یہ چوری کے ہیں۔ ہاتھ بھی نہیں لگائیں گی۔ کھانے کے وقت خوب بہت سے گھی میں سرخ سرخ تل کے دسترخوان پر رکھ دیجیے گا۔"

"تمہاری بہن کہے گی نہیں۔ شامی کباب کیا ہوئے ــ؟ نوکروں پر بگڑے گی۔"

"کسے پروا ہے، خالہ امی" ناجیہ بولی۔ "چیخ چلا کے چپ ہو جائیں گی۔ آپ ہی سوچیے۔ بھلا یہ چیزیں میرے حلق سے اتر بھی سکتی ہیں۔ باجی کو کھلائے بغیر۔"

بہت چاہتی ہو بیٹی۔ انہیں؟" خالہ امی ہنس کر بولیں۔

ہاں خالہ اماں، بہت۔ مجھے اپنی محبت کا خود بھی اندازہ نہیں" ناجیہ نے کہا: "بس اب تو میرا یہ حال ہے کہ ان ہی کے تصور میں ڈوبی رہتی ہوں۔ ان کا چہرہ نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ ان کی سنہری آواز دل و دماغ میں گونجتی رہتی ہے۔ اور۔ اور خالہ اماں ان کی محبت کی وجہ سے میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی سے ملیں۔ لوگ معلوم نہیں

کیسا زہر اتار دیتیں ان کے ذہن میں۔"

چپ ہو کر خالہ اماں نے دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔

تم آجاتی ہو بیٹی تو جیسے میری بی بی کا اداس دل گلاب بن جاتا ہے۔ ورنہ ان کی زندگی میں غموں، مایوسیوں اور پچھتاووں کے سوا اور رہ ہے کیا۔ وہ تو تمہارا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ بہت محبت کرنے لگی ہیں تم سے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ اگر ناجیہ بیاہ کر کہیں چلی گئی یا دور ہو گئی، مجھ سے تو میں کیسے زندہ رہوں گی۔"

نہیں، خالہ نہیں۔ وہ مارے جذبوں کے خالہ اماں کے پاس سرک گئی۔"

میں ان سے آج ہی کہہ دوں گی کہ باجی نہ مجھے کبھی شادی کرنی ہے نہ آپ سے کہیں دور جانا ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی! اتنی اچھی، اتنی پیاری باجی کو چھوڑ کے میں کیا کسی کم بخت سے شادی رچاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ قطعی نہیں، کبھی نہیں۔"

بڑی بی نے آہ بھری۔ "نہ جانے کیا چیز ہوتی ہے یہ موئی محبت۔ مگر ظالم ہوتی ہے نگوڑی۔ آدمی کو اجاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ برباد کر دیتی ہے۔ کوئی نہ پڑے محبت کے چکر میں۔ پروردگار بچانا سب کو کہیں وہی کھیل پھر نہ شروع ہو جائے۔"

مجھ سے کہیے نا خالہ اماں کیا بات ہے۔ ایک دفعہ آپ نے پہلے بھی اسی طرح کی بات کی تھی۔ میں نے جان بوجھ کے آپ سے یا باجی سے نہیں پوچھا کہ کہیں آپ دونوں کو ناگوار نہ گزرے۔ مگر ایک خلش سی ہے مجھے۔ بتا دیجیے نا خالہ اماں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔!" ناجیہ ان کے ستون نما بازو سے حتی المقدور چمٹ کے بولی۔ بڑی بی کے لیے کچھ کہنا دشوار نہ تھا۔ مگر آسان بھی نہ تھا! ایک گہری سانس

لے کر بولیں۔

کیا بتاؤں بچی۔ کیسی ہے ان کی زندگی۔ کیا تھی کیا ہو گئی۔ میرے سامنے کی بچی ہیں وہ جب میں ان کے ہاں نوکر ہوئی ہوں تو یہ کوئی چھ سات برس کی ہوں گی۔ میں ہی ساتھ مدرسے لے جاتی تھی، لے آتی تھی۔ اپنی بیٹی کی طرح چاہتی تھی انہیں۔ اور یہ خود بھی ان کے بزرگ بھی سب مجھے چاہتے۔ میرا لحاظ رکھتے تھے۔ ملازمہ تو کوئی کہتا ہی نہ تھا۔ ایسے اشرافوں کا ملنا آج کل محال ہے۔" چونکہ بہت سے شریفوں کا ذکر تھا لہٰذا اشرافا کی جمع اشرافوں بناتے ہوئے انہوں نے سلسلہ جاری رکھا۔" یہ بیٹا میری ہی گود میں پل کے بڑی ہوئیں۔ خالہ اماں، خالہ اماں کہتے منہ سوکھتا تھا! کیسی خوش مزاج ہنس مکھ، چونچال تھیں کہ بس تمہاری طرح ایک پل نچلا بیٹھنا نہ آتا تھا۔ ماں باپ کی لاڈلی بڑے چچا، پھوپھی کی دلاری، بڑے بھائی بڑی بہن کی پیاری۔ صورت شکل کی حور۔ ایسی کہ سب ہی جان دیتے تھے ان پر۔ بڑی ہو کے تو چودھویں کے چاند کو شرمانے لگی تھیں۔"

اب بھی کتنی حسین ہیں۔ تب تو سچ مچ زیارت ہوں گی!" ناجیہ بولی۔ نہایت دلچسپی سے بڑی بی کی باتیں سن رہی تھی۔!

" مگر اپنی صورت کا غرور نہ تھا! سیدھی سادی مہر و وفا کی دیوی تھیں۔ ہمیشہ ایک چمکتی ہوئی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رہتی۔ سب سے ہنس کے مسکرا کے بات کرتیں، اُدھار تی تک۔ نہ تھیں کہ اسی دنیا میں غم و الم اور رنج و کلفت بھی کوئی چیزیں ہیں۔ ہا۔ آ۔" وہ پھر چپ ہو گئیں! جیسے بڑی اور بکھرے ہوئے اوراق حیات کو سمیٹنے کہیں چلی گئی ہوں۔

پھر خالہ اماں۔ پھر کیا ہوا۔" ناجیہ نے نانی سے پوچھا۔

پھر کیا ہوتا بیٹا۔" انہوں نے اپنے تن و توش کے معیار کی سانس لی۔ اور بولیں "کہتے ہیں کہ بہت ہنسنے والے روتے بھی بہت ہیں۔ سو میری باجی جتنا ہنسی تھیں اتنا ہی روئیں، ابھی تک رو رہی ہیں۔ نہ جانے کب ان کے آنسو تھمیں گے کب دل کو قرار آئے گا۔"

"ابھی تک روتی ہیں۔" ناجیہ کا دل جیسا لرز گیا۔ "کیوں خالہ اماں۔ کیا ان کے والدین چل بسے تھے۔ اس لیے؟ یا بھائی بہن سے دور بیاہی سسرال ہیں۔ وہ یاد آتے ہیں۔ کیوں روتی رہتی ہیں اوہ ۔۔؟"

"بیٹیا۔ وہ بات ہی دوسری تھی۔ کبھی کہوں گی تم سے۔ تم ابھی کچی عمر کی نا سمجھ بچی ہو۔!"

"کیسے۔ خالہ اماں۔ میں نا سمجھ بچی نہیں ہوں!" ناجیہ نے خوشامد کی۔ "میں کوشش کروں گی کہ ان کا دکھ بٹا سکوں۔ ان کے غم دور کر سکوں۔ ان کے آنسو پونچھوں۔ اور انہیں ہنسا سکوں۔ آپ نے اندازہ نہیں لگایا خالہ اماں کہ میں اپنی جان سے بڑھ کے انہیں چاہتی ہوں۔ جو کچھ میرے اختیار میں ہو گا میں ان کے لیے ضرور کروں گی۔ وہ مجھ سے اگر کہیں گی کہ ناجیہ اپنی زندگی مجھے دیدے۔ میں دے دوں گی۔ بولیے خالہ اماں۔ کیا غم ہے میری باجی کو۔"

"بہت سے ہیں بچی۔ بہت سے غم ہیں انہیں۔" بڑی بی نے بالآخر کہا۔ "مگر ایسے نہیں کہ تم انہیں بٹا سکو۔ وہ ان کے اپنے دکھ ہیں۔ ساری زندگی کو ناسور بنانے والے پچھتاوے۔ پچھتاووں میں کوئی کسی کا شریک نہیں ہو سکتا۔ بیٹی۔ پچھتاوے دل سے ہوک بن کے اٹھتے ہیں۔ اور رگ رگ کا لہو نچوڑنے لگتے ہیں۔"

خالہ اماں۔ مجھے نہیں بتائیں گی آپ۔ کس بات کے پچھتاوے بس ہیں ؟ ناجیہ بیقرار تھی۔ "جلد سے جلد ان کی داستان سننا چاہتی تھی۔ ورنہ وہ شوپنگ کر کے آجاتیں تو پھر قفل ڈال لیتیں خالہ اماں اپنے لبوں پر:

بیٹا۔ اب تم اصرار کر رہی ہو تو کہتی ہوں کہ دعا سکول کی کوئی کلاس پاس کر کے جب بڑے کالج میں گئیں تو۔ ایک جنم جلا مردوا ان کی ہنستی کھیلتی زندگی میں چلا آیا۔

"کلاس فیلو۔ ؟ " آنکھیں پھاڑ کر ناجیہ نے پوچھا۔"

" اب یہ میں کیا جانوں "۔ بڑی بی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔" میری بی بی تو اس کوچے سے ناآشنا تھی۔ اس کے گھر میں تو رشتہ دار بھائیوں تک سے بات چیت کرنے کی منا ہی تھی۔ چچا اور ماموں کے بیٹے عید بقر عید یا شادی بیاہ اور سالگرہ کے موقعوں پر آتے تھے۔ مگر یہ ان کے سامنے نکلتی نہ تھیں۔ بات چیت تو دور کی بات تھی۔ اور پھر ایسا بھی تو تھا کہ ان کی منگنی ہو چکی تھی۔ ان کے چچا زاد بھائی سے۔ بڑے گھر کا بیٹا تھا۔ صورت شکل کا اچھا۔ عادت سیرت کا نیک۔ دور تک پڑھا تھا! چچا چاہتے تھے کہ جلد سے جلد بیاہ ہو جائیں۔ مگر جب بی بی نے ضد کی کہ آگے کوئی پڑھائی اور پڑھیں گی تو وہ بیچارے راضی ہو گئے۔ لیکن تقدیر کے لکھے کی خبر کسے تھی۔ منگنی ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ چچا پر سردی کا اثر ہوا اور وہ تین چار دن کے اندر چل بسے۔ اس طرح خاندان کا ایک بڑا بزرگ گزر گیا۔ ان کی بیوی بچے بہت دنوں تک نہ سنبھل سکے۔ شوہر کے بعد چچی بھی زیادہ دنوں زندہ نہ رہیں۔ ان کی بیٹی انہیں آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کراچی اپنے پاس بلا رہی تھی۔ انہوں نے بھی سوچا کہ چند دن دوسرے ملک کی آب و ہوا کھا آئیں۔ جلدی جلدی

ضروری انتظام کر کے بیٹی کے پاس چلی گئیں۔ ہائے بیٹی۔ انہیں تو جیسے قضا کھینچ لے گئی تھی۔ ابھی بھلی یہاں سے گئی تھیں۔ یاد ہے مجھے جیسے کہ ابھی کل کی بات ہو۔ رمضان مبارک کے دن تھے۔ انہوں نے پورے روزے رکھے۔ شوال کے چھ روزے بھی چھوڑتی نہ تھیں۔ آخری روزہ تھا۔ عشا کی نماز کے بعد معلوم نہیں کیوں دماغ کی شریانیں پھٹ گئیں۔ اور وہ بھی چلتی پھرتی کسی بیٹے بیٹی کو خدمت کی تکلیف دیئے بغیر گزر گئیں۔ نہ پوچھو کہ وہاں سے سطوت جہاں بیگم کا تار آیا کہ امی جان ختم ہو گئی ہیں۔ تو یہاں کیسی قیامت کی صف ماتم بچھی تھی۔ سب لوگ بس آنسو بہاتے بھر کے رہ گئے تھے۔ ایسے میں کسی نے زیادہ تے شوشہ چھوڑ دیا کہ دلہن کا قدم مبارک نہیں ہے۔ کیونکہ منگنی ہونے کے تین مہینوں کے اندر اندر ہونے والے ساس اور سسر مر گئے۔ اور سنا تھا کسی تجارت میں دولہا کے بھائی کو بڑا گھاٹا ہوا تھا۔ اب بھی دنیا والوں کا قاعدہ ہے کہ کوئی بری بات ہو تو سارے لوگ اسے بہت اچھالتے ہیں سو یہ بات بھی پھیل گئی کہ ہونے والی دلہن کا پاؤں اچھا نہیں ہے دلہن منحوس قدم ہے۔ احتشام میاں ان کے منگیتر اچھے خاصے پڑھے لکھے سمجھدار آدمی تھے مگر یہی کہتے سنتے سے دیواریں ہٹ جاتی ہیں۔ وہ برابر گھر میں سب کی زبانوں سے اور باہر والوں سے یہی بات سن رہے تھے کہ دلہن کا قدم اچھا نہیں ہے بڑے بڑے تین جانی مالی نقصان ہو گئے تھے۔ لہذا وہ بھی کچھ بددل ہو گئے تھے۔ ! پہلے ہی اس قدر سنجیدہ تھے کہ ان سے بات کرتے ڈر لگتا تھا۔ مگر

اس کے بعد تو جیسے انہیں ایک چپ لگ گئی تھی۔ نہ منھ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ بڑی بہن اور بھاوج نے انہیں بہکایا کہ منگنی توڑ دیں۔ لیکن وہ نہ مانیں۔ کہنے لگیں کہ کسی کا قدم سبز یا سُرخ نہیں ہوتا۔ ! یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ موت وحیات سب من جانب اللہ ہوتی ہے۔

"اچھے آدمی تھے۔" بڑی عقیدت سے ناجیہ نے فتویٰ دیا۔

"ہاں۔ بہت اچھے تھے۔" بڑی بی نے سر ہلا کر تائید کی۔

"مگر خالہ اماں۔ آپ اس آدمی کا ذکر کر رہی تھیں جو باجی کی زندگی میں چلا آیا تھا۔ بیچ میں منگنی کا قصہ نکل آیا۔ اس آدمی کا کیا ہوا۔" ناجیہ نے یاد دلایا۔ یوں تو اس نے سمجھداری سے خود ہی قیاس کر لیا تھا کہ ان کی شادی تو ہوئی نہ تھی۔ لہٰذا منگنی ٹوٹ ہی گئی ہوگی۔ ان کی منگنی اور منگیتر سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ چاہے وہ لاکھ فرشتہ خصلت تھے۔

"ہے ہاں۔ وہ آدمی۔" بڑی بی نے سخت نفرت اور کراہت سے دانت پیس کر کہا: "اس کا خانہ خراب جائے۔ خدا اپنا عذاب نازل کرے اس پر۔ اللہ رے نجانے اس موئے نے کیا جادو کر دیا تھا ان پر۔ بس اسی کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ اسی کے خیالوں میں گم رہنے لگیں۔ پڑھائی کی اتنی شوقین تھیں لیکن وہ بھی چھوڑ دی۔ بس دیوانی سی ہو کر رہ گئیں۔ کسی سے کہتی نہ تھیں کہ مجھ سے کہتی تھیں کہ خالہ اماں میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ میں چپکے چپکے سمجھاتی تھی کہ بٹیا۔ دیوانی نہ ہو۔ یہ مگر مرد ذات ــــ" ان کی بات رہ گئی۔ دفعتہً قدموں کی آہٹیں

سنائی دی۔ اور دوسرے لمحے ان کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ دو تین پیکٹ اور ایک باسکٹ ہاتھوں میں سنبھال رکھی تھیں۔ ناجیہ کو دیکھ کر ان کا چہرہ دمک اٹھا۔ اسی نے لپک کر ان کے ہاتھوں سے سب چیزیں لے لیں اور تخت پر رکھ دیں۔

لڑکی دیر سے بیٹھی ہے تمہارے انتظار میں۔" خالہ اماں نے ان سے کہا۔"

مجھے بھی برابر خیال آ رہا تھا کہ ناجو آئی ہوگی۔" انہوں نے بے حد محبت بھری نظر ناجیہ پر ڈالی: "لیکن ہزار چاہنے پر بھی جلدی نہ آ سکی۔ کچھ کتابیں خریدنا چاہتی تھی۔ وہ دو دکانوں دو دکانوں ڈھونڈنے میں دیر لگی۔ اچھا۔ ناجیہ۔ میں ذرا منھ ہاتھ دھو کے ابھی آئی۔

"آپ اس نیلے رنگ کی ساری میں بے حد پیاری لگ رہی ہیں۔!"

اچھا" وہ ہنس دیں۔

جی ہاں۔ پہنے رہیے۔ لباس مت بدلیے۔

بہت اچھا!" ان کے مروارید کے سے چمکدار دانت سرخ خوشنما لبوں پر عکس ریز ہو کے چھپ گئے۔ پھر وہ جاتے جاتے خالہ اماں سے بولیں۔" خالہ اماں ذرا آواز دیجیے، گل بانو کھانا لگا دے۔ ناجیہ کو بھوک لگی ہو گی۔ مجھے بھی بڑی بھوک لگی ہے۔۔ میں ابھی آئی۔!"

تمہارے لیے تمہاری ناجو کباب لائی ہے۔" بڑی بی کانپ کے اٹھتی ہوئی بولیں: میں خود تل کے لاتی ہوں۔ تم تب تک منھ ہاتھ دھوئے آؤ۔"

وہ غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔ تو بڑی نے بہت چپکے سے ناجیہ سے کہا "بیٹی

سنو۔ خیال رکھنا کہ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، وہ انہیں معلوم نہ ہو۔"

ناجیہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

کھانے پر انہوں نے ناجیہ کے لائے ہوئے کبابوں کی بہت تعریف کی۔ پھر چائے کے بعد اپنا خریدا ہوا سامان اسے دکھایا۔ کچھ کپڑے تھے۔ اور دس بارہ کتابیں تھیں پھر ایک بڑا سا خاکی لفافہ ناجیہ کی گود میں رکھ دیا۔

"تمہارے لئے سلور سوٹ ہے۔ بہت اچھا لگا تھا۔ لے لیا۔ دیکھیں تمہیں بھی پسند آتا ہے کہ نہیں۔۔؟"

اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور ایک ہلکی پرمسرت چیخ مار کے اپنی شدید پسندیدگی واضح کر دی۔ بڑا خوبصورت سوٹ تھا! سوئس کاٹن پر ڈوری ورک سے پھول بنے تھے۔ اور بہت بھلے لگ رہے تھے! اس نے سوٹ کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

انہوں نے ایک ساڑی بڑی بی کے بھی نذر کی! وہ بے دانتوں کا منہ کھول کر اور آنچل پھیلا کر انہیں دعائیں دینے لگیں!۔

آہستہ آہستہ موسم میں ناگوار گرمی آنے لگی تھی! اور لق و دق صحن میں کھڑے گنجان درختوں کے پتے دھوپ میں چمکنے لگے تھے۔!

"چلو۔ ناجیہ نیم تلے بیٹھیں۔" انہوں نے کہا اور اپنی کتابیں بھی اٹھا لیں۔ ناجیہ تو اتنے ہی عرصے میں ان کی پالتو بلی بن گئی تھی۔ فوراً اٹھ کے ان کے پیچھے ہولی۔ نیم تلے بڑا سا چکنا چکنا پتھر نصب تھا۔ یہ ان کا پسندیدہ گوشہ تھا! ایک طرف سے جنگلی پھولوں کی مہک آتی۔ دوسری طرف موگرا اپنی خوشبو پھیلاتا۔ سامنے باغ

کے سارے درختوں کی انواع و اقسام کی خوشبو میں سمیٹے ہوا آتی اور ان پر اپنا عطر چھڑک کے گزر جاتی۔ سب پر یہاں نیم کا سایہ تھا۔ ایسی رومان پرور جگہ تھی کہ یہاں بیٹھ جانے کے بعد اٹھنے کا جی نہ چاہتا۔!

حسب معمول ٹھنڈے پتھر پر کچھ بچھائے بغیر دونوں بیٹھ گئیں۔ تب انہوں نے کہا۔

"ان کتابوں کی مجھے بہت دنوں سے تلاش تھی۔ خدا خدا کر کے آج ملی ہیں۔ تم پڑھنا چاہتی ہو تو لے جاؤ۔ ایک ایک پڑھتی جانا اور دیتی جانا۔ بعد کو میں پڑھ لوں گی۔"

تاجیہ نے دیدہ زیب کتابوں کے کور دیکھ کر نام پڑھے اور ہنسنے لگی۔"

"خراشِ قلم" زر داغ دل۔ رم آہو۔ اور یہ کیا ہے۔ دشت شام۔ کف دریا۔ ادھر باجی۔ کتابوں کے ناموں ہی کا مطلب مجھے معلوم نہیں ہے پڑھوں گی کیا۔؟ آپ ہی پڑھیے۔ ہاں کوئی کتاب جاسوسی ادب کی ہیں تھی! وہ ہو تو دیدیجیے۔

انگریزی کی ہیں دو عدد۔ مسٹر پائیرٹ جاسوس کی۔ لے جاؤ۔ پڑھو۔ بڑی دلچسپ ہوں گی!

انگریزی میں ہیں۔؟

ہاں۔"

اتنی دور تک انگریزی آتی ہوتی تو میں مسز ثمرات کی بڑی بھلی کہنے کو سنتی۔ اور وہ کہہ دیں: کالج گئی تھیں تم تاجیہ۔؟

ہاں باجی۔ صرف آپ کی ناراضگی کے خوف سے۔ منہ جھٹلانے بھر کے لیے۔"

کیا مطلب ۔ ؟

مطلب یہ باجی کہ ۔ کلاس میں بس بیٹھی رہی ۔ لیکچرر صاحب مسٹر عرفان احمد نے کیا پڑھایا کیا لکھایا ۔ کچھ پتہ نہیں ۔ ان کی داڑھی دار صورت تکتی رہی ۔ اور سارا دھیان اسی طرف لگا رہا ! آپ کو پتہ ہے آج کیا گھٹنا گھٹی میرے ساتھ ۔ ؟

نہیں !۔

وہ چھوٹا سا قہقہہ لگا کے بولی ''معلوم نہیں ۔ ہمارے ممدوح جج صاحب ورات کی بیگم کو کیا شبہ ہو گیا ہے گھر پر تو میری جاسوسی ہوتی ہی رہتی ہے ۔ آج ایک جاسوس میرے پیچھے کالج تک چھوڑا گیا ۔

جاسوس ۔ کیسا جاسوس ۔ ؟ کیا کہا ہے تم نے کہ جاسوس تمہارا تعاقب کرتے ہیں ۔''

انہوں نے حیرت سے پوچھا ۔

''ارے وہ جو میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ ایک عاشق تن صاحبزادے گنسر پر آ کے فرہاد ٹائپ مکالمے سنا گئے تھے ! بس خطرے کا زبردست لال نشان سب کو نظر آنے لگا ہے شاید اسی لیے محترمہ عذرا صاحبہ جاسوسی کرنے کالج پہونچی تھیں ۔ کہ کہیں میں کالج جانے کے بہانے ان صاحبزادے کے ساتھ یہاں وہاں سیر سپاٹے کرتی تو نہیں پھر رہی ہوں ۔ خوب نمک مرچ لگا کے انہیں اپنے باپ سے کہنے کا موقع ملتا ! مگر وہاں کوئی ایسا عاشقانہ ناٹک تھا ہی نہیں ۔ بے چاری مایوس چلی گئیں ۔

تاجیہ تم بھی عذرا کی طرح اپنے والدین کے معیار پر پوری اترنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ۔ آخر وہ لوگ تم سے بھی کچھ چاہتے ہوں گے ۔ کچھ امیدیں تم سے وابستہ

کر رکھی ہوں گی۔ تم ایک سعادت مند، سنجیدہ مزاج اور کیا کہتے ہیں پڑھنے لکھنے کی شوقین بچی بن جاؤ تو سب لوگ تمہیں چاہنے لگیں گے۔ پھر نہ انہیں تم سے شکایت رہے گی اور نہ تم ان کی ناشاکی رہو گی۔

آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے ان سب کے چاہنے نہ چاہنے کی پروا ہے۔؟

"ہونی تو چاہیے۔"

نہیں ہے باجی۔ بالکل نہیں۔ میں تو سچ مچ ان سب کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔"

ناجیہ نے کہا: "ڈیڈی تک پھر ذرا غنیمت ہے۔ میری باتیں شوق سے سنتے ہیں، مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ دل چسپی لیتے ہیں۔ لیکن امی اور باجی کو نہ جانے کیا دشمنی ہے مجھ سے سیدھے منھ مجھ سے نہیں بولتیں۔ کچھ پوچھو تو نوچ کھاتی ہیں۔ اب تو حد ہو گئی ہے کہ شبہ کرنے لگی ہیں مجھ پر۔ کیا یہ بات خاموشی سے برداشت کرنے کی ہے۔ انہیں اپنے خون پر اعتبار نہیں ہے۔ مجھے ایسا ہی سمجھتی ہیں کہ میں ایک لفنگے ٹائپ لڑکے کے ساتھ سیر سپاٹے کرتی پھروں گی!"

بڑوں پر اس طرح غصہ نہیں کرتے۔ ناجیہ!" انہوں نے سمجھایا۔ "آخر وہ بھلا چاہنے والے ماں باپ ہیں۔ ان کی تفتیش کا مطلب صرف یہی ہو گا کہ تمہیں خدا نخواستہ کسی مشکوک راہ پر نہ چلنے دیں۔

میں کسی بری راہ پر نہیں چل رہی۔" ناجیہ جیسے اپنے لوگوں پر غصہ تھا۔ بولی۔" اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ بری راہیں کسی منزل پر نہیں پہونچاتیں۔ آدھے راستے ہی میں بھٹکا دیتی ہیں۔ اور پھر آدمی واپس اپنے گھر بھی نہیں پہونچ سکتا۔"

ہزار تجربوں کی بات تمہاری زبان سے نکلی ہے ناجیہ۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی
لے کر کہا اور سبز خلاؤں میں، نہ جانے کیا دیکھنے لگیں ۔ "ایسی راہوں پر چلنے والوں کے پاس
نہ عقل ہوتی ہے نہ آنکھیں ۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ کس راستے پر قدم پڑ چکے ہیں اور وہ خوبصورت
منزل کی آس میں کس طرف چل پڑے ہیں ۔ ایسے راستے کسی منزل پر پہونچتے ہی نہیں
سمندر کی امید میں سراب کے پاس جا نکلتے ہیں ۔ ان لوگوں کے پاس دیکھنے والی
آنکھیں بھی نہیں ہوتیں ۔ یا ان پر نوعمری، ناسمجھی کے اندھا دھند جذبوں کی ایسی گہری
پٹی بندھی ہوتی ہے کہ انھیں کچھ سجھائی بھی نہیں دیتا ! پھر یہ پٹی اس وقت
اترتی ہے جب ایک زبردست ٹھوکر لگتی ہے ۔ تب وجود بکھر جاتے ہیں جذبے
سسکتے ہیں اور شخصیت زخمی ہوتی ہے ۔ اس کا کہیں کوئی مداوا نہیں ہوتا ۔ پھر آنسو
ساتھی اور پچھتاوے مقدر بن جاتے ہیں لیکن کیا ہو سکتا ہے تب ۔؟ کچھ نہیں ! ناجیہ ۔ یہ
ٹیڑھے میڑھے راستے جنہیں محبت کی راہوں کا دلکش نام ملا ہے ۔ بہت خطرناک ہوتے
ہیں ۔ محبت بہت بری چیز ہے بہت بُری چیز ۔ لیکن کیسا ستم ہے کہ آدمی کو محبت پر بالکل
اختیار نہیں ! یہ ایک آزار ہے ناجیہ ایک آزار ۔ عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ ستاتا
ہے ۔ جلاتا ہے ۔ رلاتا ہے ۔ لیکن زندگی کی رعنائی بن جاتا ہے ۔ وہ لمبی سی زندگی بھی
کس کام کی جس میں محبت کا غم نہ ہو ۔ وہ دل کس کام کا جس میں کسی یاد کا دیا نہ جلتا ہو ۔
وہ لب کس کام کے ۔ جو کسی کی محبت کا نغمہ نہ گنگناتے ہوں ! محبت کتنی بری چیز ہے
مگر کتنی اچھی چیز ہے !۔"

ناجیہ انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی ۔ ان کی زندگی کی ادھوری کہانی بڑی بی بے

سن کر وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کی باجی نے کسی سے محبت کی تھی۔ یقیناً کی تھی۔ اسی شخص سے جوان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ جوان کی زندگی میں زبردستی چلا آیا تھا۔ لیکن پھر کیا ہوا تھا۔ کیا ان کی زندگی کے افسانے کا یہ دلکش اور حسین باب اچانک بند ہو گیا تھا۔ وہ ناکام محبت تھیں۔ ان کا دل زخمی تھا۔ ان کی شخصیت کرچی کرچی ہو چکی تھی۔ یہ تبسم، یہ خوش مزاجی، کیا ایک نقاب تھا۔؟ اس کے پیچھے آنسو تھے۔ آہیں تھیں۔ محبت کی ناکامی نا تمامی کا ماتم تھا! نارسیدہ خواہشوں، نا تمام آرزوؤں، ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے ارمانوں کا گریہ تھا! کیا ظالم محبت کا ناسور اندر ہی اندر انہیں کھوکھلا کر رہا تھا۔ کیا بیتی تھی ان پر، کون سا صدمہ گذرا تھا۔ جس نے انہیں گوشۂ تنہائی میں سدا کے لیے جلنے کڑھنے اور کلپنے چھوڑ رکھا تھا۔

لیکن ناجیہ حیران بھی تھی۔

اگر انہوں نے کسی سے محبت کی بھی تھی تو کون ایسا قدر ناشناس اور بے حس ہو گا جس نے ان کی سی حسین و جمیل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو ٹھکرانے کی حماقت کی ہو گی۔ پچھتاوے صرف ان ہی کی تقدیر بنے ہوں گے۔ کیا وہ کہیں مزے میں زندگی گذار رہا ہو گا۔ اسے کوئی غم کوئی دکھ کوئی احساس نہ ہو گا! کون جانے وہ ظالم ستمگر چل بسا ہو۔

اس کی باجی مدحت زہرہ کے چہرہ پر حزن و ملال محیط تھا۔ ان کی آنکھیں خلاؤں میں نگراں تھیں۔ شاید غمناک یا خوش کن ماضی کے چند پر اسرار سائے وہاں رقصاں تھے! ناجیہ کچھ پوچھ نہ سکی! ان کی کہانی چھیڑ کر ان کا اور اپنا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

ظہر کی نماز تک وہ دونوں وہیں بیٹھی نہ جانے کہاں کہاں باتیں کرتی رہیں۔ پھر دوپہر

کو جب گرمی تیز ہو گئی تو دونوں اندر والے کمرے میں آ کے کچھ دیر کے لیے سو بھی گئیں۔ جب عذرا نے نجمہ کی پلکیں بند کر دیں وہ مسحوری ان کے چہرے کے دلکش و دلفریب نقش دیکھتی رہی۔ صدف کی سی آنکھیں جن پر گہری سیاہ خمیدہ پلکوں کی جھالر لگی تھی۔ بند تھیں۔ کتنی خوشنما ناک تھی اور وہ گلابی رسیلے باریک ہونٹ جو پھول کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور حسین تھے۔ اس چہرہ کا ہر زاویہ تھے۔ وہ تو مجسم حسن تھیں۔ موزوں قد و قامت، ہیجان خیز جسم، پاک رنگت، کیا چیز ان کے سراپا میں ایسی تھی جسے کوئی نقص یا عیب کہا جا سکتا! لیکن ایک چیز ان کی بہت بری، بہت بدنما، نہایت عیب دار تھی۔ جو ان کی چاند سی پیشانی کی لکیروں میں پوشیدہ تھی۔ ان کی دشمن۔ ان کی تقدیر۔

مغرب کی نماز ان کے ساتھ پڑھ کر نجمہ اپنے گھر آئی۔ جج صاحب موجود نہ تھے بیگم سلمیٰ اور عذرا صحن میں بیٹھی تھیں۔ ملازمہ شربت بنا رہی تھی! نجمہ نے اپنا بیگ ملازمہ کے گلے میں لٹکا دیا۔ اور بغیر کچھ کہے ان کے سامنے کی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی

"ہاں جناب آپ فرمائیے۔ میرے کالج کیوں پہونچی تھیں۔" ان نے عذرا کو گھورا۔ کیا دیکھنا چاہتی تھیں آپ؟ کیا دیکھا آپ نے۔؟

جواب دینے کی بجائے عذرا نے بگڑ کر کہا۔ تمیز سیکھو تمیز۔ تم تو بی۔ اے آنرز، ایم۔ اے کی طالبات میں وقت گذار رہی ہو۔ باتیں کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھا ان سے۔؟"

اگر میں ان کے انداز میں باتیں کرنے لگوں گی تو آپ جواب نہ دے سکیں گی۔" نجمہ نے کہا۔" اور براہ کرم خیال رکھیے کہ بات بات میں ان کا طعنہ مجھے مت دیا کیجیے۔ وہ میری آئیڈیل ہیں۔ میں ان کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔

یہ پیکٹ کیسا ہے تمہارے پاس۔ کیا کچھ خریدنے گئی تھیں "؛ بیگم نے پوچھا "۔
باجی نے خریدا ہے میرے لیے۔ کیا پسند ہے ان کی۔ عالیشان۔ واہ۔" ناجیہ نے یہ کہہ کر انہیں اپنا سوٹ دکھایا۔
"ہے تو اچھا۔" بیگم نے کہا۔ "قیمت پوچھ کے دیدینا۔ کسی کا احسان لینا اچھا نہیں!"
واہ امی۔ یہ میری باجی کا تحفہ ہے۔ لاقیمت ہے بے بہا ہے۔ کیا میں چند روپے قیمت دیکر ان کی محبت اور اس تحفے کی ناقدری کروں گی۔ کبھی نہیں۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔!" ناجیہ کے لبوں سے ان کی محبت کا شہد ٹپک رہا تھا۔
تم ان کا ذکر اس قدر عقیدت و ارادت سے کرتی ہو کہ میرا بھی جی ان سے ملنے کا چاہنے لگا ہے۔ مگر —" بیگم کچھ کہتے چلی تھیں۔ استہزائیہ انداز میں ہنس کر ناجیہ نے بات اچک لی۔
آپ آج ان سے ملنے پہونچی تھیں امی۔ مگر وہ نہیں ملیں۔ اچھا ہوا۔ امی آیندہ ان سے ملنے کی کوشش بھی نہ کیجیے گا!۔
کیوں — ؟
اس لیے کہ فی الحال ان کی تمام تر محبتوں کی حقدار صرف میں ہوں "؛ ناجیہ بولی: "اور میں نہیں چاہتی کہ آپ ان سے مل کر ان کی توجہ اپنی طرف کر لیں۔ ان کی خفیف سی بے اعتنائی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ مارے دکھ کے میں مر جاؤں گی۔ پھر چاہے میرے بلا آپ روئیں چاہے گا ئیں؟" یہ کہہ کر وہ شربت پیئے بغیر اٹھ گئی۔

دے مجھے رخصت گزارش شوق کہنے تیرے حضور میری زباں
ہوں مجسّم میں آرزومندی حسرتوں میں ڈھلے مرے ارماں

صبح ناشتہ پر ان سب کی گہری خاموشی ناجیہ کو طوفان سے پہلے والا سناٹا لگ رہی تھی لیکن وہ بزدل اور نروس نہ تھی کہ گھبرا جاتی۔ وہ تو دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر جو کچھ لڑنا پڑے تو کیسے کیا جواب دینا چاہیے!! اسے تو کچھ کچھ ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جج صاحب نے تلے ہوئے انڈوں کے کئی سینڈوچ بنا لیے تھے اور ان پر چھوٹی چھری سے مکھن گھیپ رہے تھے۔ بیگم صاحبہ رہ رہ کر کیتلی پر ہاتھ رکھ کر چائے کی تپش دیکھ رہی تھیں! عذرا بیگم کی عادت تھی وہ ہلکا پھلکا ناشتہ نہیں کرتی تھیں۔ لہٰذا ان کے سامنے پچھلی رات کا پلاؤ۔ قورمہ بھی تازہ پراٹھوں اور بھنے ہوئے قیمے کے ساتھ موجود تھا۔ وہ سر جھکائے بڑے انہماک سے کھا رہی تھیں۔ ان سب پر اضطراب آمیز خاموشی طاری تھی۔

اور ناجیہ کو کوئی پرواہ ہی نہ تھی اس نے بھی اپنی رکابی میں پلاؤ کا انبار لگا رہی تھی۔ اس کی چوٹی پر بہت سارا ہی انڈیل رکھا تھا۔ اور ان سب تمیز دار، مہذب اور سلیقہ مند حاضرین کو چڑھانے اور انہیں غم میں مبتلا کرنے کے لیے منہ سے بڑا ایک نوالہ کھاتی اور پانچوں انگلیوں کا ایک ننھا سا ڈونگا بنا کے دہی سڑپ لیتی۔ اس کا ہر بڑا سا نوالہ اور سڑپ کی آواز عذرا بیگم کے رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کے ماتھے پر تین عدد شکنیں ڈال رہی تھی۔ اور جج صاحب بھی بے چارے جلدی سے سینڈوچ کاٹ کے کھانے لگتے تھے۔! بالآخر

عذرا نے کہا۔

ذرا آہستہ آہستہ بے آواز کیے کھاؤ گی تو کون سا نقصان ہو جائے گا! کھانا کب کہیں بھاگا جا رہا تھا ہے۔

کھانا نہیں بھاگ رہا۔ مگر مجھے اب بھاگنا ہے۔ دیر ہوتی جا رہی ہے" وہ بولی: "سنا ہے کہ گرمیوں میں صبح کے کالج ہو جائیں گے!" اتنا کہہ کے اس نے اپنے دانتوں میں ایک بڑی سی بوٹی دبائی اور اپنی چہیتی بلی کی طرف جھکی۔ بلی نے اپنا منہ آگے بڑھا کر بوٹی ناجیہ کے دانتوں سے لے لی۔ اور خالی کرسی پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ بس بیگم صاحبہ کے صبر کا ٹھکا چھلک گیا۔

" ہزار دفعہ منع کیا کہ ایسی گندی حرکت نہ کیا کرو۔ اس کے بالوں میں زہر ہوتا ہے۔ دمہ ہوتا ہے۔ اور عمر بھر نہیں جاتا! مگر تم کبھی کوئی کہا مانتی ہو جو یہ مانو گی۔ خدانخواستہ اگر ہو جائے دمہ۔"

بلی کا جھوٹا تو ناپاک نہیں ہوتا شاید! ناجیہ نے اپنی معلومات کے مطابق کہا۔" اس نے میرے منہ سے کھا لیا تو کون سا غضب ہو گیا۔"

اب وہ کم بخت کرسی پر بیٹھی کھا بھی رہی ہے۔" عذرا کیوں پیچھے رہتیں۔" جو کوئی اس کرسی پر بیٹھے گا۔ ساری چکنائی اس کے کپڑوں میں لگ جائے گی!"

زمین پر بیٹھ کے کھاؤ نہ۔" ناجیہ نے بلی کو کرسی سے اتارتے ہوئے کہا: "یہاں کوئی تم سے خوش نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیسی قسمت لے کے آئی ہو تم۔"

کھنکھار کر جج صاحب نے بیوی کو مخاطب کیا "سنو بھئی۔ کل میں نے بیرسٹر صاحب کے ساتھ جاکر کوٹھیاں دیکھی ہیں۔ مجھے تو بہت پسند آئیں۔ اب تم اور یہ دونوں بھی دیکھ آئیں تو بات طے کرلی جائے!۔"

"آپ جب کہیے۔ چل کے دیکھ آئیں۔" بیگم نے کہا۔ "جب آپ کو فرصت ہو۔ کہہ دیجیے گا۔"

"ڈیڈی! ناشتہ کے بعد چلیئے نا۔" بڑے اشتیاق سے عذرا نے کہا۔''

"ضرور چلینا۔ لیکن میں نے ایک صاحب کو وقت دیا ہے۔ وہ آتے ہونگے۔" وہ بولے۔ "شام کو انشاء اللہ ضرور چلیں گے۔"

"کوٹھیاں سے کیا مطلب ہے ڈیڈی۔" ناجیہ نے جان بوجھ کر پوچھا۔ "کیا کئی ہیں ہم سب الگ الگ رہیں گے۔؟"

"صرف دو ہیں۔ تم دونوں کے لیے۔" انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اور پھر اسے گھور کر بولے "ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ناجیہ۔؟"

"ضرور پوچھیے ڈیڈی۔ آپ مجھ سے اس قدر ڈرتے کیوں ہیں۔؟" ناجیہ بولی "مذاق کرتی ہو بڑوں سے۔ عذرا نے تنبیہ کی۔ انھیں ناجیہ کی بدتمیزی بہت ناگوار ہوئی تھی۔"

"مجبوری بیچاری کیا کرے گی۔ اسے تمیز سے بات کرنا کسی نے سکھایا ہی نہیں۔" بیگم نے کہا۔ "سیکھ لے گی۔ سمجھدار بچی ہے۔ جج صاحب نے جب انجمن آرائش انداز میں مسکرا کر اس کی تائید کی۔ تو وہ جھینپ گئیں۔ مگر بڑی اور بی بی کو ناگوار گذرا۔

اس لیے جاتا ہُوں۔ نے تو اسے آپے سے باہر کر رکھا تھا :

"کیسے ڈیڈی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟" ناجیہ نے بڑی تیزی سے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے بیٹی! ٹم ۔ ۔ ۔ ۔ ناجیہ تم دونوں کے ساتھ بھی پڑھتے ہیں۔" جج صاحب نے پوچھا۔ "لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کون سا لڑکا کس حیثیت سے اور کس کام سے تم سے ملنے آیا تھا۔!"
"کیا تمہاری اور اس کی دوستی اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ تم نے اس کی ضیافت ضروری سمجھی۔؟"

"نہیں ڈیڈی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" ناجیہ نے کہا۔ اس کا چہرہ کسی قدر سرخ ہوگیا تھا۔ "وہ تقریباً دو سال سے میرا کلاس فیلو ہے۔ چونکہ میں تین چار دن کالج نہیں گئی تھی اس لیے وہ دریافت کرنے آگیا تھا۔ اور ڈیڈی۔ ہمارے گھر میں جو کوئی آتا ہے اس کی ضیافت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ـــــ"

"خیر ٹھیک کیا تم نے۔" جج صاحب کا دل صاف ہو گیا۔ تو انہوں نے مزید تفصیل سنانے سے روک دیا۔ اور مزید تفصیل جو ڈائیلاگ پر مشتمل تھی۔ وہ ناجیہ کو ویسے بھی سنانی نہ تھی۔ لہٰذا اگر جج صاحب نے اطمینان کی سانس لی تو ناجیہ نے بھی لی۔ پھر جج صاحب نے بات ختم کر کے صرف اسی قدر کہا تھا۔

"اب خیال رکھنا کہ کوئی دوست گھر پر نہ آئے۔"

"جی ـــ!"

ناشتے کے بعد وہ سب طعام خانے سے نکلے۔ بیگم صاحبہ اندر غالباً لباس تبدیل کرنے چلی گئیں۔ جج صاحب کو کسی دوست کا انتظار تھا۔ وہ ہال میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے! ناجیہ! اتنے سویرے نہ اپنی باجی کے ہاں جاتی تھی نہ کالج۔ لہٰذا وہ بھی ہال میں پڑی کرسی پر ٹک کر

بہت زہرہ کی دی ہوئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی تھی ۔ لیکن زرہ کچھ پڑھ سکی نہ اس کا دل لگا۔ جب سے اس نے ان کی خادمہ کی زبانی ان کا المیہ سنا تھا۔ بہت اداس اور دل گیر رہنے لگی تھی ! ۔ وہ سارا دن ان کے پاس گزار کر آتی تھی ۔ اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اپنا دل، دماغ، اپنے احساسات سب، انہیں کے پاس چھوڑ کے آئی ہو۔ اپنے گھر میں اس کا جی سی نہیں لگتا تھا۔ عجیب سی بھولی بھٹکی رہتی تھی ۔ ان کے دکھوں پر وہ رونا چاہتی تھی ۔ معلوم تو ہوتا کہ ان کا بھی کوئی شریک غم تھا ۔ وہ سوچتی رہی ۔

ایسے بھی لوگ اس دنیا میں ہوتے ہیں جو جینے کی سزا جھیلتے ہیں ۔ ان کے دل خاک ہو چکے ہوتے ہیں ۔ ارمان ان کے دل میں اپنا مدفن بنا لیتے ہیں ۔ تمنائیں سینے میں سر نہیں اٹھا ئیں کہ کچل دی جاتی ہیں ۔

کیا کہیں نہیں رہ گئی وفاؤں کی پاسداری ۔ عہد و پیمان کا لحاظ ۔ وعدوں کی شرم ۔ کہاں ہیں ایسے لوگ ۔ یہ بد عہد، جفا پیشہ ۔ سنگدل مرد ۔ بے خبر اور معصوم لڑکیوں کو اپنے مکروفریب کے خوشرنگ جال میں الجھا کر انہیں زندگی بھر کے لئے طائر بے بال و پر کی طرح پھڑپھڑاتا چھوڑ دیتے ہیں ۔ اپنی زندگی سنوارتے ہیں دوسروں کی اجاڑ دیتے ہیں ۔ خود قہقہے لگاتے ہیں ۔ دوسروں کی آنکھوں میں آنسو بھر دیتے ہیں ۔ اور احمق نا سمجھ لڑکیاں اتنا نہیں سمجھتیں کہ ان کی محبت کبھی پھلے پھولے گی نہیں ۔ زندگی اور زندگی سے وابستہ ساری آرزوؤں کی بھینٹ لے گی ۔ پھر آنسو اور آہیں بیکار ہوں گی ۔ پچھتاوے بے بنیاد ہوں گے ۔ اور زندگی

صرف ایک سنگین سزا بن کے رہ جائے گی۔ جینے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر جینا پڑے گا۔ دنیا زنداں بلا معلوم ہوگی۔ مگر رہنا پڑے گا۔ کیا ایسا ہی ہوتا ہے مآلِ الفت۔ اور انجامِ محبت؟"
اور پھر پہلی بار اسے خیال آیا کہ محبت موت سے زیادہ سنگدل اور جفا کار ہوتی ہے۔ ان بیچاری غم نصیب وحشت زہرہ کی حیات بے ثبات کا مقصد کیا تھا۔ پرانی یادوں کی جگر کاوی۔ مصنوعی تبسم کا غلاف اپنے چہرے پر ڈالے رکھنا۔ ماحول کے خاموش ہنگاموں کو بہلا بہلا کے لبوں تک آنے سے روکے رکھنا۔ کیا انصاف ہے یہاں والوں کا۔ کسی کی زندگی آنسوؤں سے عبارت ہو۔ کوئی چمنستانِ حیات میں گل گشت کرے۔؟ کون ہوگا دم بے دردادر بے حس اور ظالم شخص جو انہیں دردِ مستقل کا تحفہ دے کر دنیا کے بازار میں کھو گیا تھا۔
جج صاحب دیر سے اسے گم صم بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ ایسی سنجیدگی اور خاموشی تو اس کی عادت نہ تھی۔ وہ تو قہقہہ بر لب۔ پارہ صفت لڑکی تھی!۔ اب کیا ہوا تھا اسے۔ کتنی دیر سے کتاب گود میں رکھے ان کے وجود سے بھی بے خبر خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچے جا رہی تھی۔ انہیں کچھ دکھ ہوا۔
ناجیہ"۔ ان سے رہا نہ گیا تو انہوں نے اسے آواز دی۔
جی۔ ڈیڈی"! وہ یکبارگی ہوش کی دنیا میں واپس آگئی۔
کیا سوچ رہی ہو بیٹی۔ دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ بہت خاموش ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔؟"
ٹھیک ہے۔ ڈیڈی۔ بس۔ میں زینی باجی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

باجی۔ باجی۔ یہ آخر کیا مصیبت ہے!" جج صاحب یکبارگی جھلا گئے "انہوں نے تمہیں
فرشتہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ ہر وقت ان کے خیالوں کے اندر ڈوبی رہتی ہو۔ ہمیشہ ان ہی
کے پاس رہتی ہو۔ کون ہیں وہ آخر۔ کون سی کشش ان میں ایسی ہے کہ تم ان کی گرویدہ ہو کر
رہ گئی ہو۔! بیٹی کسی کے پاس بھاگ بھاگ کے جانا اچھا نہیں۔ اس طرح اپنی
قدر کم ہو جاتی ہے۔

آپ کیا جانیں ڈیڈی۔" ناجیہ بولی۔ "وہ کیا ہیں۔ صورت و سیرت میں جمال
علم میں منفرد، آج تک ان کی سی کوئی دوسری شخصیت میری نظروں سے نہیں گزری۔
میرا بس اگر چلتا تو ہمیشہ کے لیے انہیں کے پاس رہ جاتی۔ وہ بہت دکھی بھی ہیں۔
ڈیڈی۔ مجھے تو ان کے دکھوں سے بھی محبت ہے۔

یہاں ہر انسان دکھی ہے بیٹی۔ تم کس کس کا ہاتھ بٹاؤ گی۔" جج صاحب بولے "اور
ابھی تمہاری یہ عمر بھی نہیں ہے کہ تم دکھوں سے پیار کرنے لگو۔ یہ تو تمہارے کھانے
کھیلنے کی عمر ہے۔ خوش رہنا سیکھو بیٹی۔ ورنہ ساری شخصیت بکھر کے رہ جائیگی۔ سمجھیں۔"
مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا۔ میں ان کے غم سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔" ناجیہ اپنی عادت
کے خلاف سنجیدگی سے بولی۔ "کم سے کم مجھے تو سکون نصیب ہوگا کہ میں کسی کے کام آئی۔!"

میں سمجھ گیا!" جج صاحب ناگواری سے بولے۔" وہ ایک معمر خاتون ہیں، جہاں دیدہ
اور تجربہ کار ہیں۔ تمہیں اس قدر رحم دل اور معصوم دیکھا ہے اور تمہیں بے وقوف بنا کے
اپنا کام نکالنا چاہتی ہیں۔ عذرا ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تمہیں آدمیوں کا کوئی تجربہ نہیں
ہے۔ تم ہر شخص سے بہت جلدی متاثر ہو جاتی ہو۔ میرا کہنا مانو۔ اور آئندہ سے

مت جایا کرو ان محترمہ کے پاس ۔!"

بڑے استقلال اور جارحانہ پیرایہ میں ناجیہ نے جواب دیا۔" دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے ڈیڈی۔ جو مجھے ان کے پاس جانے سے روک سکے! آپ انہیں جانتے ہوتے کبھی ان سے ملے ہوتے تو ایسا حکم مجھے نہ دیتے ڈیڈی۔ میں ان سے ملے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آج آپ ان کے پاس جانے سے منع کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے امی اور باجی نے منع کیا تھا۔ اگر اسی طرح مجھ پر پابندیاں لگائی گئیں تو میں سچ کہتی ہوں کہ میں پچھواڑے گوالے کے کنویں میں گر کے مر جاؤں گی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو ناجیہ۔ تم مجھتی بھی ہو کہ تمہارے منہ سے کیا نکل رہا ہے!"

جج صاحب نے کہا۔ وہ حیران تھے۔ یہ کھلنڈری سی نوعمر لڑکی کیوں اپنے جنون میں اس قدر آگے بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے نرم لہجے میں رسانیت سے پوچھا۔

"اچھا مجھے تو بتاؤ۔ وہ کون ہیں۔ کیا کرتی ہیں۔ تم سے پہچان کیسے ہوئی! تم نے تفصیل سے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"وہ کون ہیں۔؟" ٹھنڈی سانس لے کر ناجیہ نے کہا۔" کیا بتاؤں۔ کون ہیں۔ دنیا بھر کے غموں کی ماری۔ ایک ایسی ہستی ہیں' جنہیں دنیا نے اور دنیا والوں نے کچھ بھی نہیں دیا۔ ان کی خوشیاں ان سے چھین لیں۔ وہ اتنی معصوم نیک اور بھولی بھالی ہیں کہ انہیں ابھی تک ادراک نہیں ہو سکا۔ وہ اپنا سنہرا دور جرات بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔ جو اب انہیں مل نہیں سکتا۔ پھر بھی وہ خوش رہنے کی کوشش

کرتی ہیں۔ جب کہ ان کی کوئی خوشی آج تک پوری نہیں ہوئی۔"

جج صاحب اس کے منھ سے ایسی سنجیدہ باتیں سن کر حیران رہ گئے اور صرف اسی کی دلچسپی کی خاطر پوچھا۔

"کرتی کیا ہیں ان کے شوہر کا کیا نام ہے۔ کتنے بچے ہیں ان کے۔؟"

"کچھ نہیں کرتیں۔ ان کے ایک بڑے منزلہ مکان میں ایک ہوٹل کھلا ہے اس کا کرایہ ملتا ہے۔ وہ خود ایک شاندار حویلی میں رہتی ہیں۔ ان کی شادی وادی بھی نہیں ہوئی۔ وہ ایک قدیم نوادرہ کے ساتھ رہتی ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ ان کی شادی وادی نہیں ہوئی۔ ورنہ ان کی یہ انفرادیت اور تنہائی کا حسن ختم ہو جاتا!" ناجیہ نے باپ کو اپنی باجی کی ذات و شخصیت میں دلچسپی لیتے دیکھا تو اور کھل گئی۔ اور بولی

"اب آپ انصاف کیجیے ڈیڈی کہ اپنے ہمسائے میں ایک ایسی حسین، تعلیم یافتہ اور شریف ترین خاتون رہتی ہوں تو ان کے پاس جانا، ان سے محبت کرنا، ان کی شخصیت میں دلچسپی لینا اور انہیں اپنا آئیڈیل بنانا کیا کوئی گناہ ہے۔؟"

وہ چپ رہے۔ ناجیہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کو نہیں معلوم ڈیڈی وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ بی۔ اے آنرز ایم۔ اے مگر مجھ جیسی معمولی تعلیم یافتہ لڑکی سے دوبرابری کے معیار سے ملتی جلتی، ہنستی بولتی ہیں۔ مجھے محسوس ہی نہیں ہونے دیتیں کہ وہ عمر اور تعلیم میں مجھ سے کہیں برتر ہیں۔ اور ڈیڈی یہ بھی آپ کو نہیں معلوم کہ ان پر جوانی ہی آئی وہ کیوں آئی ہے۔؟"

کیوں آئی ہے۔" جج صاحب اسے گھور نے لگے

ایک آدمی نے انہیں دھوکا دیا۔ ان کے ساتھ پڑھتا تھا۔

کیا۔؟ جج صاحب چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

یس ڈیڈی۔" ناجیہ نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ مجھ سے ان کی خادمہ نے رازداری سے کہا تھا۔ آپ بھی کسی سے نہ کہیے گا۔ امی سے بھی نہیں۔ کسی پردہ نشیں کے رازوں کو ایک ایک سے کہنا اچھی بات نہیں۔

جج صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ اپنا بھاری بھرکم سگار سلگا کر دیا۔ ایک نظر دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ اور گہرا کش لے کے فضا غبار آلود کردی۔ ان کا چہرہ فکر مند لگ رہا تھا۔ اور آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھیں! پھر انہوں نے پھیکے لہجے میں کہا

"اچھا خیر۔ ساری داستان ان کی سن لی میں نے۔ اور اگر اب تم چاہو تو ہزار دو ہزار سے ان کی مدد کر دو۔ تمہارا احسان ہی مانیں گی۔!"

ناجیہ کو ان کا لہجہ ناگوار گذرا۔ آپ انہیں مدد کا محتاج مت سمجھیے ڈیڈی۔ ان کی توہین مت کیجئے۔

کلاک نے بلند آواز میں دس بجائے۔ ساتھ ہی ملازم نے اطلاع دی۔

"سرکار۔ کوئی صاحب آئے ہیں! پوچھ رہے ہیں۔ آپ گھر پر ہیں کہ نہیں۔ کیا کہدوں ان سے۔"

انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں جا رہا ہوں۔ چائے لے آنا۔"

"جی اچھا۔"

جج صاحب جنہوں نے نہایت بیدردی اور ناگواری سے ناجیہ کی باتیں سنی تھیں اُٹھتے ہوئے بولے "تم ان محترمہ سے میل جول جاری رکھنا چاہتی ہو۔ تو تمہاری مرضی۔ لیکن خبردار۔ کہے دیتا ہوں۔ آئندہ کبھی جان وان دینے کی واہیات باتیں مجھ سے نہ کرنا۔"

ناجیہ نے جواب دیئے بغیر رخ پھیر لیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے چلے گئے!

بیگم صاحبہ اور عذرا کب کی جا چکی تھیں۔ اور اب اسے بھی جانا تھا۔ بڑی بے دلی سے اس نے لباس تبدیل کیا کتابیں سنبھالیں۔ ملازم نے نورخاں کی آمد کی اطلاع پہنچائی تھی۔

وہ باہر نکلی تو نورخاں نے سلام کیا۔ اور کہا۔

"صاحبزادی آپ کے قدموں کی برکت سے بہن کے بیاہ کا انتظام ہو گیا۔ پرسوں جمعہ کو نکاح ہے۔ صاحبزادی آپ کو نکاح میں شریک ہونا ہے۔"

اچھا اچھا۔" ناجیہ خوش ہو کر بولی "میں ضرور شریک ہوں گی۔ تم پانچ چھ بجے شام کو رکشہ لے کر آ جانا اور لے جانا مجھے۔! کیا زاہدہ مان گئی ہے

ہاں سرکار۔ وہ جو زر دکھڑے بہلا کے لڑکی کو ایک طرف بٹھا دیتے ہیں۔ سو اماں نے بٹھا دیا ہے اسے۔" وہ ہنسنے لگا "بس اسی گھڑی سے اس نے رونا شروع کر دیا ہے۔ کتنا سمجھایا۔ مانتی ہی نہیں۔!" وہ بیچارگی سے بولا۔

ہاں نورخاں۔ یہی تقدیر ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی۔ بیچاریاں تھوڑی ہی مدت کیلئے ماں باپ کے گھر میں رہتی ہیں۔ پھر انہیں مرنے دم تک دوسرے گھر میں رہنا پڑتا ہے" ناجیہ نے فلسفہ ارشاد کیا۔"

اسی لئے تو کہتے ہیں صاحبزادی کہ لڑکی ذات ماں باپ کے گھر مہمان ہوتی ہے۔ بس اللہ اس کا نصیب اچھا کرے "باتوں باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ ــــ ..

رائیگاں جاتی نہیں عشاق کی سعی بیاں   اشک خوں کا زرش دنیا کو ادا کرنا پڑے

عام مشرقی خواتین کی طرح بیگم سلمیٰ کو بھی اپنی لڑکیوں کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ تھیں، پروفیسر تھیں۔ ان پر سنجیدگی اور متانت کا نقاب پڑا تھا۔ لہٰذا وہ جاہلانہ انداز میں اپنی فکر کو عیاں کرنا گوارہ نہ کرتی تھیں۔ لیکن دل ہی دل میں برابر سوچتی رہتی تھیں کہ لڑکیاں کتنی بڑی ہیں اور چار دن کی دھوپ ہوتی ہیں۔ ابھی یہاں اور ابھی وہاں۔ ان کے زمانے کو گزرے ابھی سو دو سو سال نہیں گزرے تھے۔ مگر چالیس سال پہلے اور چالیس سال بعد میں بھی خیالات اور زمانے میں زمین و آسمان، سیاہ و سفید کا فرق ہو گیا تھا۔ ان کے زمانے میں بیس سال کی لڑکی مکمل عورت کہلاتی تھی۔ اور جس کا گھر بار سے لگ کے کم سے کم دو بچوں کی ماں بن جانا ضروری تھا۔ ان کی شادی خود بھی اسی عمر میں ہو گئی تھی۔ لیکن آج کے ترقی پسند زمانے میں بیس اکیس سال کی عورت بچی کہلاتی تھی۔ نا سمجھ بچی۔ جسے گھر بار کا کرنے کا تصور تک نہیں کیا جاتا۔ اور وہ کوئی سی تعلیم حاصل کر رہی ہوتی ہے۔!

بیگم سلمیٰ دنیا کی سی خاتون ہی تھیں۔ ان پر علم نے ملمع کر دیا تھا تو کیا۔ اندر سے ان کے خیالات سو برس پرانے ہی تھے۔! وہ دل سے چاہتی تھیں کہ اب جلد سے جلد عذرا کی شادی کر دیں۔ وہ ریسرچ کر رہی تھیں۔ نہایت ترقی پسند، نڈر، بیباک تھیں۔ اتنی تیز اور کھری کہ یونیورسٹی کے لڑکے تو لڑکے اساتذہ صاحبان تک ان سے زیادہ گفتگو کرنے سے گریز کرتے۔ اکثر لیکچرر صاحبان سے زیادہ محترمہ عذرا

کی معلومات تھیں۔ اور اگر وہ حضرات کچھ غلط سلط پڑھا دیتے تو بھری ہوئی کلاس میں انہیں ٹوکنے سے عذرا ہچکچاتی نہ تھیں۔ جب وہ ایم اے کر کے کلاسوں کو خیرباد اور اساتذہ حضرات کو خدا حافظ کہہ گئیں تو سب نے سکون کی سانس لی تھیں۔! اور اب ان کا ریسرچ ورک زوروں پر تھا۔ جو بیگم صاحبہ کے نزدیک محض وقت اور عمر کا ضیاع تھا۔ ان کے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا ان کے منگیتر کو جلد وطن واپس کر دے اور ساتھ ہی ان کے اور ان کے والدین کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ فوراً عذرا کو بیاہ لے جانے پر مصر ہو جائیں۔ عذرا کے سلسلے میں چونکہ جج صاحب کو بھی اطمینان تھا لہذا وہ بھولے سے بھی ان کی شادی بیاہ کا ذکر نہیں چھیڑتے تھے۔ اور عذرا جو ڈاکٹریٹ کر رہی تھیں اس میں بھی جج صاحب کی مرضی کا بہت دخل تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا ورک دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ اور اکثر خوش ہو کے کہتے تھے۔!

"میرا داماد طب کا ڈاکٹر ہے۔ اور بیٹی ادب کی ڈاکٹر ہے۔ خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔ کیسا اچھا جوڑ ہے۔"

لیکن بیگم سلمیٰ کے تلووں سے لگی تھی۔ کب آئیں گے ان کے منگیتر صاحب اور کب صاحبزادی کے ہاتھوں میں مہندی رچے گی۔!

انہیں ناجیہ کی بھی فکر تھی! اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ابھی بچی لگتی تھی۔ معصوم، شریر، بھولی بھالی۔ لیکن بیگم کو اس کی فکر بھی پریشان رکھتی۔ کیوں کہ وہ خانہ داری اور گرہستی کی ذمہ داریوں سے کوسوں دور

تھی۔ نہ اس نے کبھی باورچی خانے میں جھانکا تھا اور نہ کبھی ہاتھ میں سوئی پکڑی تھی۔ کیا ہونا تھا اس کا حشر۔ وہ ان کے کمرے میں سوتی تھی۔ اور اسے دیکھ دیکھ کر بیگم کا دل دھک دھک کیا کرتا! لڑکی ذات کو اپنی دسوں انگلیاں دس چراغ کر کے سسرال جانا پڑتا ہے تاکہ وہاں اُجالا پھیلا سکے۔ ماں کے گھر میں تمام تک لڑکی کی تقدیر کوئی تقدیر نہیں ہوتی۔ اس کی تقدیر تو سسرال کی چوکھٹ پھلانگنے کے بعد لکھی جاتی ہے!

جج صاحب سے کبھی انہوں نے ناجیہ کے لاابالی پن کا ذکر کیا تو انہوں نے ایسی نظروں سے بیوی کو دیکھا جیسے انہیں صحیح الدماغ نہ سمجھتے ہوں۔

"کیا کہا تم نے۔؟ وہ حیران رہ جاتے۔ ناجیہ کی فکر کاہے کی فکر ہے اس کے بارے میں۔ کیا کہا ہے اس نے۔؟"

"سنیئے جی۔ آپ تو اسے اب بھی بچی ہی سمجھتے ہیں۔ مگر۔؟"

"کیا اگر مگر" جھنجھلا کر وہ کہتے۔ وہ بچی نہیں ہے تو عمر رسیدہ خاتون بن چکی ہے کیا مطلب ہے تمہارا۔ وہ مصلّیٰ اور تسبیح سنبھالے بیٹھی رہے۔ خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔! میں دیکھتا ہوں تم اس غریب سے قطعی محبت نہیں کرتیں — تمہاری ساری توجہ اور محبت صرف عذرا کو ملی ہے۔ ناجیہ بھی تو آخر تمہاری ہی اولاد ہے۔ اسے خود سے کیوں دور رکھتی ہو تم۔؟"

"آپ سے ایک بات کیا کہی کہ آپ نے پورا لیکچر دے دیا۔" وہ بھی بھنّا تیں۔ آپ دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اس کی حرکتیں دیکھتے تو میری ہی تائید کرتے۔

کچھ حد نہیں ہے اس کی شرارتوں کی۔ دن بھر مجھے جھجواتی ہے۔ ہفتہ بھر پہلے آم کے درخت پر چڑھ گئی اور ساری کیریاں توڑ کے پاس پڑوس کے بچوں میں بانٹ دیں۔ میں نے کچھ اچار کے لئے اور کچھ آموں کے لیے لگی رہنے دی تھیں۔ اب ایک نہیں ہے درخت میں۔ آپ ہی نے فرمائش کی تھی کہ ڈنگر کا اچار بنانا۔ اب نہ بن سکے گا!۔

نہ نے "جج صاحب بولے" باسط کو پیسے دو بازار سے لے آئیگا۔ تم بھی بچوں کی برابری کرتی ہو۔ بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

سنتے تو ہیں نہیں آپ۔" وہ بگڑیں "اس دن نل میں پائپ لگایا اور اس کا رخ مالی کے کمرے کی طرف کر دیا تھا وہ ایک گھنٹے کے بعد بسورتا ہوا آیا کہ اس کے پڑے کھانا پکانے کے برتن سب ڈوبے پڑے ہیں پانی میں۔"

"ہاں ہاں سیلاب آگیا تھا اس کے کمرے میں" جج صاحب نے جواب دیا "اس سے کہو کہ خدا کا شکر ادا کرے۔ وہ خود نہیں ڈوب گیا۔"

"میرا مطلب تو آپ سمجھے نہیں۔ اسی کی تائید کرنے لگتے ہیں۔"

کیا مطلب ہے تمہارا۔؟

میرا مطلب یہ ہے کہ بچے ماں سے نہیں ڈرتے۔ اس کا رعب نہیں مانتے۔ اس کا کہا نہیں کرتے مگر باپ سے ڈرتے ہیں۔ ان سے خائف رہتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ آپ ذرا اسے نصیحت کیجیے۔ ڈانٹیے۔ ڈپٹیے۔ آخر عورت بچی ہے۔ ایک کے گھر جانا ہے اسے بھی۔ یہ عادتیں پختہ ہو جائیں گی تو سسرال میں کیسے نبھے گی۔ ہماری طرح وہاں اس کے ناز کون اٹھائے گا۔ آپ اسے سمجھائیں گے تو وہ ضرور سمجھ جائے گی۔"

"نہیں۔ میں اسے نہیں سمجھاؤں گا۔" جج صاحب کچھ برہم ہو گئے۔ "اسکی معذرت
تمہاری مجھے بھلی لگتی ہیں۔ جب وہ سسرال جانے کے قابل ہو گی تو خود بخود اسے آ بھی
آجائیگی اور اب تم بھی مسلسل اس کے پیچھے پڑ کر ہراساں کرو۔ اس طرح بچے راہِ راست پر
تو آتے نہیں۔ منتقمانہ کاروائی پر اتر آتے ہیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ ہمیں اپنے عمل
پر برابر سے جواب دے۔؟"

میں تو چاہتی تھی کہ۔ عذرا کی شادی کے بعد ناجیہ کی بھی فکر کرتی۔" دبی زبان
سے وہ بولیں۔ "اللہ رکھے شادی کی عمر دل میں تو ہے۔"

نہایت برافروختہ ہو کر اور حد سے زیادہ اکتا کر جج صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے۔
ٹھیک ہے۔ کوئی پیغام منگواؤ اور عذرا سے پہلے ناجیہ کو سسرال پہونچاؤ۔ کم سے
کم تمہاری ایک فکر تو دور ہوئی اور تم چین سے سو سکو گی۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے بیگم صاحبہ کو کڑی نظروں سے گھورا تھا۔ غنیمت تھا کہ بیگم
کا رخ چھت کی طرف تھا۔ وہ ان کی نظریں دیکھ نہ سکیں! اور جج صاحب ایکبار اہا اور لاحول
پڑھ کے چلے گئے تھے۔

جج صاحب کی خادمہ خادم ہیں بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں ان کے ہاتھ تو مٹر
کے دانے الگ کر رہے تھے مگر کان ان دونوں کی باتوں کی طرف تھے۔ جب جج
صاحب چلے گئے اور انکے قدموں کی آہٹیں معدوم ہو گئیں تو انہوں نے بیگم کی دلدہی کیلئے ایک لمبی
سانس لی اور بولیں۔ "شادی بیاہ کی بات ان سے کرنا کیا! سامنے خالی کرنے سے کوئی فائدہ؟
نہیں اسی باپ کے بیٹے ہیں جس نے مٹری اور خون کی پچھال بین میں جوان بہن کو گھر میں بٹھالے

بٹھا لے بدبھا کر دیا۔ حسرت نصیب کو اندر اندر دق لگ گئی اور غریب گور کا نوالہ ہو گئی۔ تم تو میاں سے کہنے کے بجائے اللہ کی درگاہ میں دعا مانگو کہ اصل خیر سے بچیاں گھر در کی ہو لیں۔ اچھا ہاں۔ وہ جو کمال کی ماں نے ذکر کیا تھا" تم نے ان سے کہا۔؟"

معلوم ہے مجھے۔ کہہ کے جو جواب سنو گی" بیگم نے کہا" مجھے پاگل بنا بیٹھے اور لاحول پڑھیں گے۔ جاتے رہتے ہیں خدیجہ سے ملنے۔ وہاں اگر کچھ کہہ دیا تو ان کا دل بھی برا ہو گا۔ ارے اماں۔ میں تو حیران ہوتی ہوں۔ زمانے کا رنگ ان سے بھی چھپا نہیں ہے۔ اچھے لڑکے گولر کا پھول ہو گئے ہیں۔ جو کما تا بچا تا نصیب زادہ مل جائے وہی غنیمت سمجھیں۔ لڑکیاں اپنے ٹھکانے لگیں تو احسان ہے خدا کا۔ اس کے علاوہ اماں کل کس نے دیکھا۔ کوئی عمر لکھا کے نہیں آیا۔ یوں اللہ ان کی بڑی عمر گزرے ہم سب پر انہیں سوا سو سال سلامت رکھے مگر میں کہتی ہوں کہ اپنے سامنے لڑکیاں اٹھ جائیں تو برا کیا ہے۔ ہم بھی اللہ رکھے ان کا سکھ چین دیکھیں۔ ان کے بچے بالے کھلائیں۔ مگر ان کی سمجھ میں آئے تو کوئی بات۔۔!"

تم بھی تو آخر بچیوں کی ماں ہو۔ اپنی کہی کیوں نہیں کرتیں۔ بڑھیا نے ورغلایا۔ میاں ہی مرضی پر ٹرکا کے کیوں بیٹھی رہتی ہو۔ وہ تو اسی طرح نہیں پاگل بنائیں گے۔ لاحول پڑھیں گے۔ تم تو بس خدیجہ کے لڑکے کی بات پکی کر لو۔"

" ان کا مزاج جانتے بوجھتے آپ ایسی باتیں کرتی ہیں تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔ اٹل رہتے ہیں اپنی مرضی پر۔ لاکھ ماں باپ نے منع کیا مگر دادا کی بچی کو نہ

"بچے ہی کے دم لیا۔ یاد نہیں آپ کو" بیگم نے جلبلا کے کہا۔"

"تو خیر برا کام نہیں کیا۔" بڑی بی بولیں "ماں باپ اور بڑی بہن کو حج کرا دیا تھا۔ حویلی نہ بکتی تب بھی حج ہوتا۔ وہ لوگ کوئی نادار فقیر تو تھے نہیں۔ آج وہ محل کی محل حویلی ہوتی تو اس کی قیمت لاکھوں آتی۔ کیا ہوا۔ کوڑیوں کے مول وکیل صاحب کی ہو گئی۔"

"اللہ ہاں ان کا دل پلٹے" بڑی بی نے آہ بھر کر کہا۔ "تم کہو تو میں تذکرہ کروں میری تو کچھ سنتے ہی ہیں"

"سنتے ہیں تو سن لیجیے۔"

نہ جانے بیگم کی کے دل کی لگی کا اثر تھا یا خدا کو منظور تھا۔ دوسرے تیسرے دن جج صاحب کے نام ٹیلیگرام آیا کہ جرمنی سے عذرا کے منگیتر عفان آ رہے تھے۔

لگا جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔ دونوں گھرانوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ تار تو جج صاحب کو ملا ہی تھا مگر اسی شام کو عفان کے والد احسان صاحب بھی اپنے نام کا تار لیے ہوئے آئے! وہ جج صاحب کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور بچپن کے دوست بھی۔

"کہیے جناب! اب کیا ارادہ ہے؟" انہوں نے جج صاحب سے کہا۔ "کب بھیجوں تمہاری بھاوج کو تاریخ لینے۔ عفان بس ایک مہینے کے لیے آ رہے ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ بیٹے بہو کو کم سے کم بیس دن اپنے پاس رکھوں۔"

"بس جم جم آئیے تو بیجیے۔" بیگم تو کھلی پڑ رہی تھیں۔ بولیں "آپ کی خوشی بھی پوری ہو ہی جائے گی۔ مگر۔۔۔"

اب کیا مگر۔ بھئی!" احسان صاحب بولے۔ اب ان مگرمچھوں اور گھڑیالوں کو بہ
اَب ہی رہنے دو۔ ہاں۔ اچھا کہو کیا کہہ رہی تھیں۔؟
میں یہ کہہ رہی تھی کہ جس طرح آپ کا جی چاہتا ہے۔ بیٹے بہو آپ کے سامنے رہیں
اسی طرح میرا جی بھی چاہتا کہ بیٹی داماد میرے سامنے رہیں۔!۔"
اب یہ میٹھا ہے بڑا جسٹس بنا ہوا کہو اس سے کہ انصاف کرے بولے۔ اور
جج صاحب کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔
جناب ہفتہ بھر تو شادی کی گڑبڑ میں گذر جائیگا!" جج صاحب نے کہا: لہٰذا اس
کا حساب نہ کیجئے رہ گئے پچیس دن۔ تو ایک دن کی رعایت آپ کو دے رہا ہوں۔ آپکا
بیٹا بہو تیرہ دن آپ کے پاس رہیں گے اور میری بیٹی داماد بارہ دن میرے پاس۔ میرا
انصاف پسند آیا۔؟"
کب آئیں گی بھاوج تاریخ لینے۔ بیگم نے پوچھا۔
پہلے صاحبزادے تشریف لے آئیں۔ اس کے بعد۔!
احسان صاحب شاذ و نادر ہی یہاں آتے تھے۔ اور جب بھی آتے تھے ان کی بہت
خاطر ہوتی تھیں۔ لہٰذا اب بھی ایک معقول دسترخوان سج گیا ان کے سامنے۔ عذرا
اپنے کمرے میں تھیں۔ ان کے پاس چپکے سے صرف نا جیہ ہی بیٹھی تھی۔ وہ اسی سے باتیں
کر رہے تھے!
چچا میاں تو کیا باجی جرمنی چلی جائیں گی۔؟" اس نے پوچھا۔
ہاں۔ بیٹی۔ غالباً۔

تو ہم سمجھ لیں کہ ہمیشہ کے لیے گئیں۔! اتنی دور سے بار بار کیا آئیں گی۔
ایک دن اسی طرح تم بھی چلی جاؤ گی۔!"

جی نہیں۔ ایسا میرا کوئی ارادہ نہیں۔

اس خوف سے کہ وہ منہ پھٹ کچھ کہہ نہ دے۔ بیگم نے اسے کسی کام سے اٹھا دیا۔ وہ برا سا منہ بنا کے اٹھی اور عذرا کے پاس چلی گئی۔

ان کا حال تو یہ تھا کہ من چاہے تو منڈیا ہلائے۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے چہرہ غمزدہ بنا رکھا تھا۔

چلیے۔ خوش ہو جائیے" ناجیہ نے ان سے کہا۔" بہت بیزار رہتی تھیں آپ مجھ سے اب نجات ہی۔ میاں کے ساتھ خوش رہیے گا۔ میری صورت برسہا برس نظر نہ آئے گی۔"

۔ کون چاہتا تھا ابھی کہیں آنا جانا۔ خدا خدا کر کے تو ڈاکٹریٹ شروع کی تھی۔ کتنا ارمان تھا مجھے کہ میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا جائیگا۔" عذرا نے کہا۔" مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا ہے۔

اور باجی بیکار کی باتیں مت کیجیے۔" ناجیہ بولی۔ ہمیشہ عفان بھائی کے نام پر آپکے چہرے پر گل و گلزار کھل اٹھتے تھے۔ اب یہ منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔ شادی ہوگی۔ مزے میں چل دیں گی۔ بھولے سے ہم لوگ یاد نہ آئیں گے۔

تو کیا سچ مچ ایسا ہی ہوتا ہے۔؟" عذرا نے پوچھا۔" اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔!

سُنا تو یہی ہے۔ ناجیہ بولی۔

تمہاری شادی ہو جائے گی تو کیا تم بھولے سے بھی کسی کو یاد نہیں کرو گی۔!

میری شادی وادی کچھ نہیں ہو گی۔

کیسے نہیں ہو گی۔ امی کو تمہاری فکر کچھ کم ہے۔

ہو گی فکر۔ مگر میں نے تہیہ کر لیا ہے۔ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔

اچھا اچھا۔ عذرا مسکرائیں۔

احسان صاحب جب چلے گئے تو جج صاحب نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"لیجئے۔ خوش ہو جائیے۔ خدا نے آپکی سن لی۔ بہت پریشان تھیں۔ چلو جا لگی لڑکی برسوں کے لیے۔ آرام سے سوئیے گا۔"!

بیگم تو خاموش رہیں مگر جج صاحب کی معنوی ماں نے جواب دیا: "عجیب طرح کی باتیں ہوتی ہیں میاں تمہاری بھی۔ خدا کا شکر نوادا نہیں کرتے کہ لڑکی بھلے گھر کی ہو رہی ہے۔ آج کل کا سا کوئی خرخشہ نہیں۔ غارت گیا کوئی لین دین کا جھگڑا نہیں۔ اپنوں کے گھر میں راج کرے گی۔ نہ کہ بیوی کو طعنہ دے رہے ہو کہ بچی بیاہنے کے بعد سکون کی نیند سوئیں گی! لڑکی کا معاملہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ جب تک ماں باپ کی چھاتی پر بیٹھی رہتی ہے۔ سکھ کی نیند کوئی نہیں سو سکتا۔ مگر تمہارے گھر کا باوا آدم نرالا ہے۔ تم لوگ بیٹیوں کو باپ کے گھر ہی میں بڈھا کر کے قبر کے حوالے کر دیتے ہو۔!"

جی ہاں"۔ جج صاحب نے خشک لہجے میں کہا۔ اُدر شادی کے بعد لڑکی لافانی ہو جاتی ہے نہ اسے موت آتی ہے نہ اسے قبر پوچھتی ہے۔!

یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ منحوس نگوڑی۔" بڑی بی للکاریں۔"

"بس بار بار مجھے ہر بات میں آپا زیب النساء کا طعنہ مت دیا کیجیے!" جج صاحب برہم ہو گئے۔ "والد صاحب جب تک زندہ رہے یہی طعنہ سنتے رہے۔ اب میں سن رہا ہوں۔ ہزار بار کہا ہے کہ ان بیچاری کو ہڈیوں کی دق ہو گئی تھی۔ اسی میں گئیں۔ ان کی موت کا تعلق شادی کے ہونے یا نہ ہونے سے نہیں ہے۔ مگر عورتوں کا دماغ ہے۔ جو بات دماغ میں گھس جائے۔ بس وہی صحیح ہے۔ دوسرے غلط بیان کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔!

اچھا میاں مان گئے۔ منہ سے ایک بات نکل کے پچھتائی۔" بڑی بی نے اپنے سوکھے ایسے گالوں پر توبہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب گڑے مردے مت اکھاڑو شادی بیاہ کے موقعوں پر خواہ مخواہ کی باتیں نہیں کرتے۔ اصل خیر سے شادی کی تیاریاں کرو۔ میں مجھتی ہوں۔ ابھی کچھ خریداری کرنا باقی ہے۔

میں کیا جانوں۔" جج صاحب نے کہا۔ "انہیں سے پوچھیے۔ خریداری وریداری کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں بہت مصروف ہوں۔! جتنی رقم درکار ہو کہہ دیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی کمی نہ رہے! کوئی نام نہ رکھے بس۔"

کمی کوئی نہ رہے گی۔ خدانخواستہ وہاں نام رکھنے والا کون ہے۔ چچا کے گھر جا رہی ہے۔" بڑی بی نے کہا۔ بیگم خاموش ہی بیٹھی رہیں۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں اور کہہ نہ سکتی تھیں۔ وہ بڑی بی آسانی سے کہہ رہی تھیں۔ ان کی بات کے جواب میں جج صاحب نے کہا۔

"چچا کے گھر جائے یا ماموں کے گھر جائے جب رشتے دوسرے ہو جاتے ہیں تو بات چیت

کے طریقے بدل جاتے ہیں۔" وہ بیوی سے مخاطب ہوئے۔" کیوں بھئی کتنی رقم درکار ہوگی۔ میں بینک سے لے آؤں۔ اب تو سر پہ پڑی ہی ہے۔ بھگتنا پڑے گا۔!
دل ہی دل میں کھول کر مگر رزم لہجے میں انہوں نے کہا۔" اور تو سب کچھ ہے مگر مسہری فرنیچر اور سنگھار میز۔"
بات کاٹ کر جج صاحب نے کہا۔ یہ کاٹھ کباڑ وہ لاد کے نہیں لے جائیگا۔ ویسے دنیا مزدوری ہے۔ میری رائے اگر قابل قبول ہو تو ایک معقول رقم کا چیک ان کی نذر کر دیا جائے! خرید لیں گے جو مرضی ہوگی۔"
آپ کو تو بات بات پر غصّہ آیا جا رہا ہے!۔" بیگم نے شکایت کی۔
کہاں آرہا ہے غصّہ۔" انہوں نے مزید غصّہ ہو کر کہا۔" میں تو خوش ہو رہا ہوں اس کے بعد دوسری کا نمبر لگے گا۔! اس طرح گھر یوں خالی ہوگا کہ گورستان لگے گا۔ کسی سے بات کرنے کو ترس گی۔
میاں کچھ حواسوں سے اتر گئے ہو کیا۔؟" بڑی بی نے للکار کے کہا۔" عجیب طرح کی باتیں کر رہے ہو بیوی سے۔ ارے۔ بیٹیاں بیاہنے کا جی نہ چاہتا ہو تو نہ بیاہو۔ پال اٹھاؤ ان کا۔ یہ دل باتیں آخر کس لیے ہیں۔ تم نے کیوں کر لی شادی۔ رہتے یوں ہی سدا"
کاش رہتا یوں ہی۔" انہوں نے کہا اور رخ موڑ کر صحن میں دیکھنے لگے۔ اتنے میں ناجیہ اپنے کمرے سے نکلی۔ کسی قدر عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ اور خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ خوشبو محسوس کر کے جج صاحب نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اور خود

کو نارمل کرتے کے لیے مسکرائے!۔
کہیں جا رہی ہو بیٹی۔ ؟
جی ڈیڈی۔
کہاں جا رہی ہو۔ ؟
نور خاں کی بہن کی شادی ہے۔ اس نے مجھے خاص طور سے مدعو کیا تھا۔!
یہ نور خاں کون صاحب ہیں۔ ان سے تمہاری پہچان کب کی ہے۔!
جی۔ دو سال سے جان پہچان ہے ڈیڈی۔" ناجیہ بولی۔" جج صاحب کی تفتیش پر اسے غصہ آ گیا تھا۔ اور یہ بھی اندازہ کر رہی تھی کہ بیگم اور بڑی بی بھی اسے تعجب اور شک کی نظروں سے گھور رہی تھیں۔
دو سال سے جان پہچان ہے۔ کیا وہ صاحب گھر پر بھی تشریف لاتے ہیں۔؟
جی ڈیڈی۔ تقریباً روز ہی آتے ہیں۔!
کیا بکواس کر رہی ہو یہ۔" بیگم نے للکارا۔" کون ہے یہ آدمی۔ روز کیسے آتا ہے جو ہمیں پتہ نہیں چلتا۔؟ تمہاری حرکتیں نا قابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں ناجیہ۔ میں کالج سے اٹھوا لوں گی تمہیں! کہے دیتی ہوں۔"
میں نے تمہیں تاکید کر دی تھی ناجیہ کہ مرد دوستوں سے ملنا جلنا ٹھیک نہیں ہے۔" جج صاحب مسلسل غصے میں تھے۔ ناخوشگوار لہجے میں بولے۔"
آئندہ احتیاط رکھوں گی ڈیڈی۔ مگر فی الحال مجھے ایک ہزار روپیہ دے دیجیے۔ سخت ضرورت آن پڑی ہے۔" چکنا گھڑا ہو کر وہ بولی۔"

کیا کرو گی۔ کیا کام ہے۔؟" انہوں نے پوچھا۔

ڈیڈی ہر مہینے آپ باجی کو دو ہزار روپے جیب خرچ دیتے ہیں۔ اور ان سے نہیں پوچھتے کہ کیا کام ہے۔ کیا کرو گی۔ میں صرف ایک ہزار مانگ رہی ہوں تو آپ جرح کر رہے ہیں۔" ناجیہ نے کہا اور سب کو مشتعل کرنے کے لیے بولی "خیر۔ اب اللہ کا شکر ہے۔ باجی جا رہی ہیں ان کا جیب خرچ اب میری طرف منتقل کر دیجیے۔ ساری زندگی آپ کی عمر و اقبال کو ــــ"

ناجیہ نہایت نامناسب بات ہے۔" جج صاحب نے کہا۔ لڑکوں کی دوستی ان کے ساتھ گھومنا پھرنا ان پر خرچ کرنا، سخت معیوب بات ہے۔ تم ایک شریف اور اعلیٰ خاندان کی بیٹی ہو۔ تمہیں اس طرح آن بان سے اور معزز ہو کے رہنا چاہیے۔ اس وقت تو بس ایک ہزار روپے دیتا ہوں مگر آئندہ نہیں دوں گا۔" انہوں نے نوٹ جیب سے نکال کر اسے دے دیئے۔

یہ نہیں پوچھیں گا کہ یہ ایک ہزار کرے گی کیا۔" بیگم جو ناجیہ سے لگی ناراض رہتی تھیں۔ ناگوار لہجے میں بولیں۔"

نور خاں کی بیٹی کے لیے کوئی تحفہ خریدوں گی۔ خالی ہاتھ جانا ٹھیک نہیں۔ بس اس کے سوا کوئی دوسرا مصرف نہیں ہے۔" ناجیہ نے کہا۔"

ابھی جج صاحب اور بیگم کچھ کہہ نہ سکے تھے کہ ملازم نے آ کر ناجیہ سے کہا

بی بی۔ وہ نور خاں آ گیا ہے۔ بلا رہا ہے آپ کو

اچھا میں ابھی آئی۔!" ناجیہ نے کہا۔ پھر اسے یکبارگی ہنسی آ گئی۔

"ڈیڈی وہ نور خاں ہمارا کٹنے والا ہے۔ وہ روزانہ مجھے باغ لے جانے آتا ہے آپ لوگ اس کا نام بھول گئے اور کتنی بڑی بات ہے کہ مجھ پر شک بھی کیا۔!

آج اس کی بہن کی شادی ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شادی میں ضرور شریک ہوں گی۔ لہٰذا وہ مجھے لینے آیا ہے! میں جاؤں۔ ڈیڈی۔؟

اب جج صاحب کو اپنے اوپر اور عورتوں پر بھی غصہ آ گیا۔ مگر اسے پی کر بولے۔ تو پھر تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں تمہیں گاڑی میں پہونچا آتا۔!

نہیں۔ ڈیڈی۔ وہ بہت غریب لوگ ہیں:" ناجیہ بولی۔" میں رکشے ہی پر جاؤں گی۔ گاڑی میں جاکر ان کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔"

اور تم رکشے والے کی بہن کی شادی میں شریک ہوگی۔ شرم نہیں آئے گی۔" بیگم نے کہا۔" وہاں سب رکشے والوں کی عورتیں ہی جمع ہوں گی۔ ان میں جا بیٹھو گی تم بھی ـــــ؟"

امی ان غریب عورتوں میں بیٹھ کر مجھے فخر محسوس ہوگا۔" ناجیہ نے کہا۔" امیروں کی محفل میں بیٹھ کر جو گھٹن مجھے محسوس ہوتی ہے۔ وہ وہاں نہ ہو گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک دھار دار نظر سب پر ڈالی۔ اور ایک جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ مشکل ہی ہے کہ اس کا دماغ درست ہو سکے۔!" بیگم نے کہا۔"

اپنی انسان دوست اور عالی ظرف بیٹی پر تمہیں فخر ہونا چاہیے۔!" جج صاحب کو بولے۔ اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔

کچھ دیر بیگم اور بڑی بی ناجیہ ہی کی غیبت کرتی رہیں۔ پھر سر جوڑ کر عذرا کی شادی کی باتیں کرنے لگیں۔"

—————————

سنبل و باراں سے کبھی بجھ نہ سکے ہجر کی آگ   کیا کبھی سچ بھی نکلتے ہیں طلن کے سپنے۔

موسم گرما ختم پر تھا۔ اب آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھانے لگے تھے۔ کبھی کبھی آغاز برسات کی بوندا باندی ہو جاتی تو موسم بدرجہا سہانا اور دلکش ہو جاتا۔ درخت نہا دھو کے چمکدار ہو جاتے۔ پھول کھلتے" اور مٹی کی سوندھی سوندھی مہک سے طراوٹ کے ساتھ ساتھ دل سے اجنبی سی ہوک بھی اٹھنے لگتی۔ بعض خوشبوئیں ماضی کی نہ جانے کون سی بات کی یاد دلاتی ہیں کہ یاد تو گرفت میں نہیں آتی۔ مگر ایک عجیب سی اداسی دل کی دنیا میں بکھیر دیتی ہے۔!

پچھلی رات موسم کی بہت زبردست بارش ہوئی تھی۔ خوب بجلیاں چمکی تھیں۔ بادل گرجے تھے۔ ساری رات پانی برستا تھا۔ اور صبح کے قریب جب بارش تھمی تب ایک حسین سا دن طلوع ہوا۔ آفتاب کی کرنیں چھلکے پتوں پر جمے پانی پر منعکس ہو رہی تھیں۔ اور اسے دھنک رنگ میں بکھرا رہی تھیں۔ ایک گھنے درخت کے پتوں میں چھپی کوئل کوہو کوہو کی پکار سے دلوں کو زخمی کر رہی تھی۔ بہت لطیف اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ پچھلی راتوں کی تپش اب ٹھنڈک میں بدل چکی تھی۔

جج صاحب کے گھر میں عذرا کی شادی کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ بیگم نے کچھ نیا زیور اور خریدا تھا۔ نئے ملبوسات لے آئی تھیں۔ اور دولہا میاں کی نذر کرنے کے لیے ایک چیک بھی تیار تھا۔ اس عرصے میں جج صاحب نے چھوٹی چھوٹی دو کوٹھیاں خریدی تھیں۔ ایک عذرا کے جہیز میں دی جانے والی تھی۔ چاہے وہ اس میں رہتی کہ نہ رہتی

ناجیہ کے نام کی بھی ایک تھی ۔ مگر نہ اس نے کوٹھی دیکھی نہ اس سے دل چسپی لی ۔
بیگم جتنی خوش تھیں اتنی ہی متفکر بھی تھیں لیکن جج صاحب باطن بھی ناخوش تھے
اور بظاہر بھی خوش اور مطمئن دکھائی نہ دیتے تھے!۔
دو دن قبل عذرا کے منگیتر وطن آگئے تھے ۔ ان کے ساتھ ان کے والدین اور
بھائی بہن بھی جج صاحب کے یہاں آئے ۔
ناجیہ نے ان کے جرمنی جانے وقت انہیں دیکھا تھا! معمولی قد و قامت اور گندمی
رنگت کے آدمی نے اس پر کوئی عمدہ اثر نہیں چھوڑا تھا ۔ صرف ان کی تعلیم ہی ایک قابل لحاظ
جوہر تھی وہ مستقبل میں بڑے سول سرجن ہونے والے تھے ۔
لیکن وہ والدین کے ساتھ اس کے گھر آئے تو ناجیہ نے آنکھیں پھیلا کر انہیں دیکھا
جیسے کہ وہ غیر ملک کی ہوا کھا کے بدل گئے تھے اور خاصے خوبرو اور جاذب توجہ ہو گئے تھے
عذرا ان کے مختصر کنبہ کے سامنے نہ آئیں ۔ مگر ناجیہ تو گھر بھر میں سب سے
چھوٹی تھی اس کا فی الحال کوئی تیمار دار کہیں نہ تھا ۔ لہٰذا وہ سب کے پاس بیٹھی ۔
بے دلی سے شادی بیاہ کی باتیں سن رہی تھی ۔ اپنی ان چچی صاحبہ کو وہ جانتی تھیں ۔ خاصی
تیز مزاج اور مغرور تھیں ۔ اپنے شوہر کے عہدے، بڑے صاحبزادے کی دولتمندی ، انکی
بیوی کے لائے ہوئے جہیز پر نازاں ۔ سونے میں زرد اور موتیوں سے لدی نہایت محتاط انداز
میں بات کر رہی تھیں! ناجیہ نے انہیں یکقلم ناپسند کر دیا ۔ ان کے چچا میاں احسان صاحب
گرمدار قہقہہ لگا رہے تھے ۔ اس نے انھیں بھی پسندیدگی کی نظر سے اتار دیا ۔ البتہ عقیل
اسے اچھے ۔ وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھے مسکرا مسکرا کر سب کی باتیں سن رہے تھے ۔

اور وہ رہ کے اپنی دولہا کی سی پوزیشن کا احساس کر کے سر جھکا لیتے تھے۔ یہ ادا ناجیہ کو اچھی لگ رہی تھی۔ انھوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ اور سرگوشیوں میں اس سے باتیں کرنے لگے۔

"تمہارا نام ناجیہ ہی ہے نا" انہوں نے پوچھا "دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ بڑی خاموش ہو۔ کیا بات ہے۔ میں نے تو تمہاری شرارتوں کی داستانیں سنی تھیں"

"آپ نہ جانے کب کے لیے میری باجی کو لے جاتے ہیں" ناجیہ بولی "میں خوش تو نہیں ہو سکتی نا۔ خاموش ہی بیٹھ سکتی ہوں۔ آپ کے ساتھ شرارتیں بھی نہیں کر سکتی۔ پہلے ہی بہت بدنام ہوں۔!"

"نہیں بھئی۔ تم ایسی بچیاں ہنستی بولتی اچھی لگتی ہیں۔ چپ چاپ نہ بیٹھو۔"

"بھائی جان۔ کیا سچ مچ آپ بہت جلدی چلے جائیں گے۔؟"

"ہاں۔ ایک ہی مہینے کے لیے آیا ہوں۔"

"پھر باجی کو کب لائیں گے۔؟"

"جب وہ آنا چاہیں گی، بھجوا دوں گا۔ اگر سنو۔" انہوں نے ایک رسالہ اپنے چہرے کے برابر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری باجی ہیں کہاں۔ ابھی تو جھلک تک دکھائی نہیں دی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ یہاں آ کے ہم سب کے ساتھ بیٹھیں گی۔ کیا بہت شدید پردہ نشین ہیں؟"

"ہیں تو نہیں" ناجیہ بولی۔ "مگر اب اتنی زیادہ ترقی پسند بھی نہیں ہیں کہ اپنی سسرال اور شوہر کے پاس آ بیٹھیں۔ آپ نے سنا نہیں۔ اگر دلہنیں شرماتی نہیں ہیں تو سہرا پہننے تک ان کے منہ پر نور نہیں اترتا۔"

"کیوں اس سے نہیں اترتا۔!" وہ ہنسنے لگے۔

آسمان پر سے ۔ اور کہاں سے ۔۔!"

سنو بیٹی ۔" وہ پیار سے بولے "کیا تم پانچ منٹ کے لیے ان سے ملنے کا انتظام نہیں کر سکتیں ۔ میں ان سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ اس رشتے پر راضی ہیں ۔ یہ زبردستی کی بات تو نہیں ہے ۔؟"

میں آپ کی طرف سے پوچھ کے آجاؤں ۔؟

نہیں نہیں تم یہیں بیٹھی رہو ۔ نہ جانے کیا الٹی سیدھی بات پوچھ آؤ ۔!

آپ نہیں جانتے "ناچیہ نے انہیں اطمینان دلایا" باجی اس رشتہ پر راضی ہی ہیں ۔ ورنہ کسی طرح ان کی مرضی کا پتہ چل جاتا ۔ اب تو بہت خوش ہیں ۔ کل ہی امی کے ساتھ جا کے اپنی پسند سے لباس اور زیور خرید کے لائی ہیں ۔

انہوں نے تعلیم تو شاید ختم کر لی ۔

جی ہاں ۔ ایم ۔ اے ہیں ۔

اچھا اچھا ۔ خوشی ہوئی ۔

ڈاکٹریٹ کر رہی تھیں ۔

واقعی ۔؟

جی ہاں ۔!

بزرگوں کی باتیں دیر میں ختم ہوئیں ۔ ایک عمدہ ضیافت سے نپٹ کر وہ لوگ سر شام گئے تو شادی کی تاریخ دیتے گئے اور عذرا پر اپنی ملکیت اور مرضی کا بیل چڑھا گئے کہ اب مردانہ یونیورسٹی میں مزید تعلیم کے لیے بھجوانے کی ضرورت نہیں ۔ شادی میں صرف پندرہ دن باقی رہ گئے تھے بیگم

جنہیں عذرا کی شادی کا ارمان تھا۔ بڑی جلدی تھی۔ وہ تو شادی کے انتظامات میں مصروف ہوگئیں۔ جج صاحب کے ذمہ بھی بہت سا کام تھا۔ کوٹھی پر نیا رنگ کروانا روشنی کا انتظام، بورچیوں کا بندوبست، کارڈ چھپوانا۔ انھیں بیگم کے آرڈر مل چکے تھے مگر وہ خاموش سے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی بھاوج کی گفتگو میں بھی زیادہ حصہ نہیں لیا تھا۔ ضروری باتیں تو بیگم ہی نے کی تھیں۔

اور اب جب ناجیہ کالج جانے کیلئے نکلی تو انھیں باہر برآمدے میں گم صم بیٹھے دیکھا۔ ان کے چہرے پر خوشیوں کا تاثر، شگفتگی اور بشاشت نہ تھی۔ شب خوابی کا گاؤن پہنے بیٹھے تھے۔ انھوں نے بالوں میں برش بھی نہ کیا تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ جیسے سلگانا بھول گئے تھے۔

ناجیہ انہیں ماں سے زیادہ چاہتی تھی۔ وہ ان کے سامنے بڑے اسٹول پر جا بیٹھی۔! اور غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

کیا بات ہے ڈیڈی۔!" ان کے زانو پر ہاتھ رکھ کر اس نے دردمندی سے پوچھا۔" آپ اتنے پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ کو باجی سے جدائی کا خیال پریشان کر رہا ہے۔ ڈیڈی۔ یہی بات ہے نا؟۔"

نہیں۔۔" انہوں نے ایک بہت گہری سانس لی"۔ یہ تو لڑکی کی تقدیر ہے۔ وہ پیدا ہی ہوتی ہیں جدا ہونے کے لئے۔ میں شادی وادی کے خیال سے پریشان نہیں ہوں۔"

تو پھر آپ کی طبیعت خدانخواستہ کچھ ــــــ۔"

میں ٹھیک ہوں!" انہوں نے تھکی مسکراہٹ سے کہا"۔ بس نجانے کیوں رات

کی طوفانی بارش نے مجھے بہا کے پچیس برس پہلے کے زمانے میں پہونچا دیا۔ بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں بیٹی کہ وہ گذرتے ہوئے ماہ وسال کی گرد میں دب جاتے ہیں۔ مگر وہ مرتی نہیں۔ زندہ رہتی ہیں۔ انسان اپنے مشاغل میں کھو کر خود کو یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کرتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بھولتا نہیں۔ دل کے کسی تہ خانے میں پرانی یادیں ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں۔ اور اگر کبھی اچانک یاد آجاتی ہیں تو بہت اذیت پہونچاتی ہیں۔

احمقانہ انداز میں ناجیہ نے پوچھا: "آپ کو بھی کسی کی یاد آرہی ہے ڈیڈی؟"

"میری زندگی ان گنت یادوں سے پُر ہے بیٹی!"

کس کی یادیں ہیں وہ سب۔ ڈیڈی۔؟

بس ہیں بیٹی۔ کیا کہوں کس کی ہیں" وہ بیدلی سے مسکرائے۔

ڈیڈی۔ آپ کو کسی سے شدید محبت تھی شاید!" ناجیہ نے سادگی سے کہا۔

اتنی بے تکلفی سے محبت وغیرہ کی باتیں مت کیا کرو ناجیہ۔ اگر تمہاری امی سنیں گی تو فوراً مجھ پر الزام رکھ دیں گی کہ میں نے ہی تمہیں اس قدر بے باک کیا ہے۔

"جج صاحب بولے" اور اپنے بڑوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے! سمجھیں؟"

ڈیڈی۔ یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ۔ وہ جو اپنے ہمسائے میں میری باجی رہتی ہیں نا۔ ان کے ساتھ بھی ایسی ٹریجڈی ہوئی تھی!"

جھینپے یا نادم ہوئے بغیر ناجیہ بولی: "ان کا قصہ مجھے ان کی پرانی خادمہ نے سنایا تھا۔"

کیا سنایا تھا!" جج صاحب کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

میں کیا سناؤں۔ آپ پھر کہیں گے کہ بڑوں کے سامنے اتنی بے تکلفی سے محبت وغیرہ کا ذکر مت کرو۔!" ناجیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"نہیں کہوں گا! تم سناؤ۔" بے دلی سے وہ بولے

"انہوں نے بھی کسی سے محبت ہی کی تھی ڈیڈی۔ کالج کا کوئی ساتھی تھا شاید" ناجیہ نے کہا۔ تفصیل مجھے انہوں نے نہیں بتائی۔ بس اتنا ہی معلوم ہے کہ انہوں نے تو اس شخص سے سچی محبت کی تھی۔ لیکن وہ آدمی بے وفا، دھوکے باز اور جھوٹا نکلا۔ انہیں اپنی محبت کا غم دے کے کہیں روپوش ہو گیا۔ پھر نہیں ملا۔ اسی غم میں تو انہوں نے شادی نہیں کی۔"

"بس اس قدر ہے ان کا قصہ؟" جج صاحب نے کہا۔

بہت کچھ ہوگا۔ مجھے اتنا ہی معلوم ہے ناجیہ نے کہا۔ اب میں ان سے کیسے پوچھتی۔ ڈیڈی آپ ان سے ملئے نا ایک دن۔ آخر ہمسائے ہیں نہ ایک دوسرے پر حق بھی ہے۔

عجیب باتیں کرتی ہو ناجیہ۔ میں بھلا ان سے کیسے مل سکتا ہوں؛" جج صاحب نے کہا۔ ان کے لہجے میں ملامت اور تنبیہ نہ تھی۔ کچھ حسرت تھی اور کوئی ناکامی۔ "کیوں نہیں مل سکتے ہیں ڈیڈی۔" بڑے جوش میں ناجیہ نے کہا "اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اب نہ آپ جوان ہیں اور نہ وہ۔"

جج صاحب دفعتاً ہنس پڑے۔ "ناجیہ! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم جوانی، محبت، اور شادی بیاہ کی باتیں بڑے فراخدلی سے کرنے لگی ہو۔ تمہاری لیبی بڑی بیباک معلوم ہوتی ہے۔ اور اب میں تمہیں آگاہ کر دوں کہ آئندہ تمہارے منہ سے

میں ایسی باتیں نہیں سن سکوں گا۔ سمجھیں۔"

ناجیہ کسی سے خم کھانیوالی نہیں تھی۔ بولی: "میں نے نہیں شروع کیں ایسی باتیں میں تو آپ کو اداس اور گم صم دیکھ کر صرف وجہ پوچھی تھی۔ یاد محبت کا ذکر آپ نے چھیڑا تھا ڈیڈی۔ میں نے نہیں۔ میں تو ایسی فضول باتیں خود بھی کرنا نہیں چاہتی:۔ محبت۔ ہنھہ!"

جج صاحب نے اسے گھور کے پوچھا: "فوراً ہٹاؤ یہ تذکرہ۔ اور اب بتاؤ۔ تم کہاں جا رہی ہو؟"

"پہلے کالج اور واپسی میں باجی کے یہاں!۔ مجھے سو روپئے کی ضرورت ہے۔"

"اب کیوں۔ پہلے ہی ایک ہزار لے چکی ہو تین چار دن پہلے۔ کیا تحفہ دیا تم نے دلہن کو؟ بتایا نہیں۔"

"کیا بتاتی۔ ایسی باتوں سے خوش ہونیوالا کون ہے؟" ناجیہ نے برا سا منہ بنا کر کہا: "امی اور باجی امارت اور دولت کے ایسے اعلیٰ اور اونچے سنگھاسن پر بیٹھی ہیں کہ وہاں سے انہیں غریب لوگ حشرات الارض معلوم ہوتے ہیں۔ اور آپ سے بھلا ایسی معمولی باتیں کیا کرتی۔"

"میں نے پوچھا تھا۔ دلہن کو کیا تحفہ دیا۔؟"

"نشانے ہیں۔" پیسے رکھ کے دے دیئے۔ خرید لے گی جو دل چاہے گا۔ تحفے وغیرہ تو میں پہلے ہی دے چکی ہوں۔ آپ کو بھلا کیا معلوم۔" یہ کہہ کر وہ یکبارگی ہنسنے لگی۔

"کوئی سنگین شرارت کی ہے تم نے۔ تبھی اس طرح ہنس رہی ہو۔" جج صاحب مسکرائے۔

"آپ وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے کوئی سزا نہ دیں گے تو میں آپ سے ایک راز کی بات کہوں۔" وہ ہنستے ہنستے بولی۔

"کبھی میں نے تمہیں کوئی سزا دی ہے؟" جج صاحب نے شکوہ کیا۔

دی تو نہیں مگر میرا اقبالی جرم بہت بڑا ہے۔ حبس دوام کا مستحق ا،، ناجیہ ہنس کر بولی :

کہئے۔ جرم کا اقبال کروں یا نہ کروں ؟۔

جب سزا نہ ملے گی تو جرم کا اقبال کرنے میں کیا حرج ہے ؛، جج صاحب کا موڈ آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا تھا۔

ڈیڈی وہ جو آپ کی الماری سے پانچ ہزار چوری گئے تھے اور امی اور باجی کی ساریاں ان کے کپڑے ۔ وہ ۔ وہ ۔،،

وہ تم نے نکالے تھا ؟ حیران رہ کر جج صاحب نے پوچھا۔ کیوں نکالے تھے۔ کس کو دیئے ؟۔

"نور خاں کو" ڈیڈی۔"

آنکھوں کا کاجل چرایا تھا تم نے ناجیہ ا،

کیونکہ ڈیڈی ۔ بے چارہ [illegible] ہے ۔ [illegible] پیسے [illegible]

کو گھسیٹتا جاتا ہے۔ بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے قابل پیسے نہیں کما سکتا اپنی بہن کی شادی کیلئے بہت پریشان تھا۔ بندوبست تھا نہیں اور لڑکے والے ۔ دھمکی دے رہے تھے کہ اگر جلدی شادی نہ کی گئی تو رشتہ توڑ دیں گے ؛۔ آج کل ہم ایسے لوگوں کیلئے ہی لڑکی کی شادی مسئلہ بن گئی ہے ۔ وہ تو پھر بھی بیچارہ غریب تھا۔ مجھ سے اس کی پریشانی دیکھی نہ گئی اس لئے کی تھی میں نے چوری۔ روپے اور کپڑے پاکر وہ اس قدر خوش ہوا کہ مجھے اندیشہ ہوا۔ مارے خوشی کے وہ کہیں بے ہوش نہ ہو جائے۔ بے چارے نے سکون سے بہن کی شادی کر دی ۔! :

بہت اچھا کیا تم نے۔ ایک نیک کام کیا ۔ جج صاحب اس کا کندھا تھپک کر بولے :، مگر چوری

کی تمہیں کیا ضرورت تھی۔ تم نے چپکے سے مجھ سے کہا ہوتا۔ میں اس غریب بچی کی پوری شادی کا انتظام کر دیتا۔

سچ مچ ڈیڈی۔ آپ کر دیتے انتظام۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

ہاں میری بچی! ایک گہری سانس اور لے کر جج صاحب نے جواب۔" کبھی کوئی نیک کام کر کے احساس سے بھی روح پر رکھا ہوا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ بھی میرا وہم کہ واقعی ہوتا ہے ایسا!"

ڈیڈی آج آپ مجھے بے انتہا دکھی اور مغموم لگ رہے ہیں۔ سچ بتایئے کیا بات ہے۔ کیا میں کسی سے کچھ کہنے جاؤں گی۔؟" اس نے بڑی رازداری سے کہا۔

جج صاحب کو ہنسی آگئی۔ یقیناً آپ کسی سے کچھ نہ کہیں گی۔ مگر میں اپنا کوئی راز آپ سے کیوں کہوں گا۔!

اللہ ڈیڈی! وہ ٹھنکی۔

اب تم جاؤ بس۔ ہاں سو روپئے مانگ رہی تھیں۔ جج صاحب نے سو کا نوٹ اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" کیا کرو گی ان پیسوں کا۔"

بریانی خریدوں گی۔ شامی تکڑے لوں گی۔ میں اور باجی جان مل کر کھائیں گے۔"
ناجیہ نے کہا اور اپنی کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

معلوم نہیں۔ یہ تمہاری باجی محترمہ کیا حشر کریں گی تمہارا۔ اچھا جاؤ۔ خدا حافظ۔"

آپ کو کورٹ جانا نہیں ہے ڈیڈی!"

دو بجے تک جاؤں گا۔ فی الحال سی۔ بی۔ آئی کو کہیں جانا ہے۔ آرڈر مل گیا ہے کہ میں کہیں جاؤں نہیں۔ لہٰذا منتظر بیٹھا ہوں ان کا۔ جج صاحب نے کہا اور بیزار ہو کر سگریٹ سلگایا۔ ناجیہ

نے انہیں خدا حافظ کہا اور رہنوں کی طرف مڑ گئی۔

دن کے دس بج چکے تھے۔ اور اب کالج جانا بے کار تھا۔ اس نے ایک ہوٹل سے اپنی پسندیدہ چیزیں خریدیں اور پھر واپس مڑ کر اپنے ہمسائے کے ہاں چل دی۔

اس فردوس بکنار گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی روح میں ایک الوہی ٹھنڈک سرایت کر جاتی تھی۔ اب بھی دلپذیر مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ اور دل میں عجیب سی خوشی کا سمندر موجزن ہو گیا۔

چپکے سے زینے طے کر کے اوپر پہونچی۔ ہمیشہ کی طرح یہاں اب بھی سناٹا تھا۔ ان کی خادمہ باورچی خانے میں مصروف تھیں اور خود مدحت زہرہ اپنے پسندیدہ پتھر پہ نیم تلے بیٹھی ایک خوبصورت کتاب حدیث خواب کا مطالعہ کر رہی تھیں۔

ناجیہ شوخی سے انہیں ڈرانے والی تھی۔ مگر انہیں اپنا ہاتھ بار بار آنکھوں کی طرف لے جاتے دیکھ کر وہ سنجیدہ بن گئی۔ اس نے ان کی ایک آدھ ہلکی سی آہ بھی سنی تھی۔ اور جب اس کا دل بے قابو ہونے لگا تو اس نے بے اختیار ان کے گلے میں اپنی کونپل سی باہیں حائل کر دیں۔

اوہ۔ ناجو تم ہو آج گئیں نہیں کالج۔ کیوں اس قدر ناغے کرتی ہو؟۔

وہ جھوم کر ان کے سامنے آ گئی اور ان کا چہرہ تکنے لگی۔ وہ مسکرائیں اور کتاب میں ریشمی تاگے کی نشانی رکھ کے کتاب بند کر دی۔

آپ کی آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔ باجی۔ میری قسم سچ بتائیے۔ آپ کیا روئی تھیں؟

اس طرح بات بات اپنی قسم کھانا بہت بری بات ہے" انھوں نے کہا۔

تم اپنی قسم نہ بھی دیتیں تو میں بتا دیتی کہ میں رو دی تھی۔

کیوں میری باجی۔۔" ناجیہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے ہونٹوں سے لگا لیا۔ کیا ہے اس کتاب میں، کس کی لکھی ہے۔ کیا کوئی حزنیہ ناول ہے؟"

نہیں ناجو۔ یہ ایک عظیم اور مشہور شاعر کا کلام ہے۔۔" انہوں نے بتا دیا۔ اردو زبان کے مشہور و معروف شاعر عبدالعزیز خالد کا نام تم نے شاید سنا ہو۔ وہ سارے عالم اسلام کے شاعر ہیں اور میں تو ان کی اتنی پرستار ہوں کہ کبھی نہیں سمجھتی ان کا سا بے مثال اور لازوال شاعر ماضی اور حال میں کوئی دوسرا بھی ہے۔ وہ تو مستقبل میں بھی اپنا اور اپنی شاعری کی بقا کا سامان ساتھ لائے ہیں۔ تم ان کا تھوڑا ہی سا کلام پڑھو گی تو ایسی گرویدہ ہو جاؤ گی کہ بے اختیار کہہ اٹھو گی۔ حقیقت میں شاعر جسے کہتے ہیں وہ یہی ہے۔۔"

کون سے اشعار پڑھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے بھی سنائیے،" ناجیہ نے کتاب کھول کر انھیں تھما دی۔ اور ہمہ تن اشتیاق بن گئی۔

حکایت نئے سنو!" انھوں نے کہا اور بے انتہا دلپذیر انداز میں پڑھنے لگیں۔

بدن سے شعلے لپکتے ہیں سینہ جلتا ہے
پکارے رات کے سناٹے میں تجھے رکھیا

تو میرا میں تیری باقی بنان وہم و گماں
میں اہل آرزو اہل جہاں سے بے پروا

بکھیرتی ہیں ہوائیں جہاں گلاب کے پھول
وہیں ہے تاج محل میری آرزوؤں کا

ارم کہیں انھیں فرخندہ رہ گزاروں کا
دو عاشقوں نے جہاں زیست کا مزہ پایا

مری غذا تری یادیں مری شراب آنسو
اب اور درد جدائی سہا نہیں جاتا

ہے داستاں مری ایک لمبی گہری آہ
بنے گا کتبہ مری قبر کا شہید وفا

برہ کی آگ میں جلتی ہوں کل نہیں پڑتی
غم فراق نے صبر و قرار لوٹ لیا

نہ رات رات مرے لئے نہ دن دن ہے
سکون قلب ہے اک بھاگتا ہوا سایہ

اب اشک و آہ مری زندگی کے ساتھی ہیں
ہیں سوتے جاگتے ماتم نشاط رفتہ کا

رہے جو یک دل و یک جاں بنے وہ پردیا
جو اپنے بس میں نہ ہو اس کے عہد و پیماں کیا

خوشی حرام ہوئی مجھ پہ تیرے جانے کے بعد
قرار پھر نہ دل بے قرار کو آیا

مداد خون جگر سے بیاض حسرت پر
شب فراق میں لکھتی ہوں نسخۂ آدونا

چھپا ہے برہ کے بادل میں آس کا مہتاب
ہجوم درد میں گم ہو گئی شب وعدہ

پکارتی ہیں تجھے دھڑکنیں مرے دل کی
فغاں ہے میری غزل مرثیہ مرا نغمہ

میں بھول جاؤں تجھے کس طرح یہ ممکن ہے
بجھا ہے تیرا الوٹ استوار عہدِ وفا

سکھائی مجھ کو غمِ عشق نے اداکاری
ہنسی مذاق ہے میرا نمائشی سارا

دکھائی دیتی ہوں مگر خوش تو محض مجبوراً
سمجھ کے فرض نبھاتی ہوں کاروبارِ وفا

بس باجی بس۔ ناجیہ نے ان کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ آپ کے آنسو نکلے تو بجا نکلے۔ یہ اشعار نہیں ہیں۔ کسی ہجرہ کی ماری کی فریاد ہے۔ آپ اتنے متاثر کن اشعار کیوں پڑھتی ہیں۔ پہلے ہی آپکا دل دکھا ہوا ہے۔ آپ تو طربیہ ناول اور مزاحیہ کتابیں پڑھا کیجئے۔

دل کو سکون و تسکین دینے والی چیزیں یہی تو ہیں ناجیہ۔، انہوں نے کتاب تپائی پر رکھ دی اور پھیکے انداز میں مسکرائیں۔، ہنسی مذاق کی باتیں تبھی اچھی لگتی ہیں جبکہ دل پر کوئی چوٹ نہ لگی ہو۔ آدمی ہر فکر و غم سے آزاد ہو۔ اسے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا مفہوم بھی نہ معلوم نہ ہو۔ لیکن جس شخص کی ساری زندگی ہی غم و الم کی ایک بند کتاب ہو اسے طربیہ اور مزاحیہ کتابوں میں وقتی سکون تو مل سکتا ہے۔ لیکن دائمی تسکین نہیں مل سکتی۔ یہ تو فرار کی ایک خود ساختہ کوشش ہے۔ اور ناکامئ محبت کے بعد اپنے خیالوں، محسوسات اور جذبوں سے فرار ممکن نہیں ہے ناجیہ۔ دھوکا ہے۔ کیا آدمی خود کو دھوکا دے کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ شاید نہیں۔

باجی۔ ڈرتی ڈرتی ناجیہ بولی آپ سے ایک بات پوچھوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں
مجھے معلوم ہے۔ تم یہی تو پوچھو گی کہ میں ایسی کیوں ہوں۔ مجھے کوئی خوشی
کیوں سزاوار نہیں ہے۔ انھوں نے ہولے سے کہا۔۔ میں کھوکھلی ہنسی کا سہارا
کیوں تلاش کرتی ہوں۔ تنہائی میری ہمدم و مونس کیوں ہے میں تنہا رہنا کیوں
چاہتی ہوں۔ عام عورتوں کی طرح میرا گھر بار کیوں نہیں ہے۔ مجھے کیا دکھ ہیں
غم و الم میرے ساتھی کیوں ہیں۔ یہی نا۔ یہی پوچھنا چاہتی ہو نا تم؟

جی۔ !۔۔ وہ ہونق ہو رہی تھی " مجھے آپ کو دیکھ کر بہت افسوس
ہوتا ہے۔ آپ اتنی حسین ہیں۔ اتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ مثالی ہستی
ہیں۔ آپ کی شخصیت خاص ہے پرکشش ہے۔ آپ کو پسند کرنا۔ آپ کو
چاہنا تو ہر شریف آدمی کا حق ہے۔ پھر۔ کیا ہوا کہ کسی نے آپ کو ۔۔
مطلب یہ کہ کسی کو آپ نے قریب آنے کی اجازت نہ دی۔ تنہائی کو ساتھی
بنا لیا۔ اور اپنے غم و الم کی آپ ساجھی بن گئیں۔ آپ کا دل کیوں ٹوٹ گیا۔
باجی۔ کیا ہوا تھا۔ جو آپ نے گوتم کی طرح باہر کی دنیا تیاگ دی۔ میں
آپ کو کیا بتاؤں باجی کہ شاید آپ کی عمر کی میری امی بھی ہوں گی۔ مگر وہ شاید
جانتی بھی نہ ہوں گی کہ دکھ کسے کہتے ہیں۔ غم و الم کس چیز کا نام ہے وہ زندگی
سے بھرپور دلچسپی کشید کرتی ہیں۔ ہنستی ہیں۔ قہقہے لگاتی ہیں۔ ہر دوسرے
تیسرے مہینے ہزاروں کی شوپنگ کرتی ہیں۔ اور خود کو اس قدر سجانے سنوارنے
رکھتی ہیں کہ اپنی عمر سے کہیں کم لگتی ہیں۔ حالانکہ آپ کا حسن انھیں نصیب
نہیں ہے "

حسن ... ساری تقریر کے جواب میں انھوں نے بڑے طنز و حقارت سے کہا کیا چیز ہے یہ حسن تباہی و بربادی کا ساخسانہ گناہوں کی ترغیب دینے کا ذریعہ، ایک وقتی جنوں کا ساخسانہ۔ یہی ہے اگر حسن تو اس سے اچھی وہ بدصورتی ہے جو عورت کو دلی و روحانی سکون اور ایک اپنے گھر اور اپنی چھت کا تحفظ دیتی ہے، کیا اسی پر فریب حسن نے مجھے برباد نہیں کیا!"

ناجیہ سہم گئی تھی۔ انھیں اس کا سوال ناگوار گذرا تھا۔ تبھی تو وہ بگڑ گئی تھیں۔ ان کا چہرہ دکھ۔ پریشانی اور پشیمانی نجانے کن کن جذبوں کا آئینہ دار بن گیا تھا۔

انسان ایک عجیب مخلوق ہے ناجیہ۔ وہ اندھا کنواں ہے اس کے دل کی تہہ میں کون کون سے احساسات ہیں۔ اسے خود بھی خبر نہیں۔ تم نے ایک دفعہ ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر آدمی کسی ایسی ویسی راہ پر چل نکلتا ہے تو پھر منزل نہیں پہنچتا۔ اور جب وہ حیوانی عقل کے زیر اثر آجاتا ہے تو عواقب کو بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ تک سوچنے کی اسے فرصت نہیں ہوتی کہ وہ جذبے جنہیں وہ بڑے شوق سے سینے میں پال پوس رہا ہے۔ حباب ہیں۔ بلکہ حباب تو کچھ دیر پانی کی سطح پر قائم بھی رہتے ہیں۔ جذبے جلد ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ آدمی اگر سمجھ داری اور ذی فہم ہوتا ہے۔ تو محبت کے احساس ہی کو زندگی کی فرہنگ سے خارج کر دیتا۔ نجانے کیا چیز ہے یہ محبت بھی جس کسی سے ہوتی ہے اس پر تن من دھن قربان کرنے کے بعد بھی حسرت رہ جاتی ہے کہ چند زندگیاں اور ملی ہوتی تو وہ بھی شمار کر دیتے۔ بار جیت کی پرواہ کیے بغیر،

وہ خود ہی اپنی کہانی کہنے لگی تھیں۔ ناجیہ نے جی کڑا کر کے پوچھا
ہار آپ کی قسمت میں لکھی تھی شاید۔ اور جو جیت گیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"
ناجیہ! نے محبت کا نقش اول اس قدر گہرا اور پائیدار ہوتا ہے کہ لوح دل پر
ہمیشہ کے لئے کندہ ہو جاتا ہے۔ زمانے کی تیز اور مسلسل گردش بھی اسے
مدہم نہیں کر سکتی۔ بعض یادیں زندگی کی رعنائی اور حیات کا سرمایہ ہوتی ہیں
ان سے فرار کا جی نہیں چاہتا"
کیا۔؟" بے حد حیرت سے ناجیہ نے کہا "آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ عجیب
بات ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈیڈی بھی ایسے ہی افسردہ اور گم صم بیٹھے تھے میرے
وجہ پوچھنے پر انہوں نے یہی کہا تھا کہ چند یادیں ہیں جو انھیں افسردہ کر رہی ہیں۔
مگر میرے لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے اور کچھ نہیں کہا۔ مگر مجھے یقین ہے
کہ انھوں نے جوانی میں کسی نہ کسی سے محبت ضرور کی تھی۔
ہاں ناجیہ۔ کون شخص دنیا میں ایسا ہے جس کے دل میں کوئی چراغ نہیں
روشن ہے" انہوں نے ادھوری سانس لے کر کہا "ممکن ہے۔ تمہارے
ڈیڈی کی زندگی بھی غم کی رعنائی سے عبارت ہو۔
اتنے میں خالہ اماں نے وہاں آ کے افسانہ حیات کا سلسلہ ختم کر دیا! اپنی
مالکن سے بولیں۔
اب بارہ بجنے والے ہیں تم نے بعد نماز فجر دو توس کھا کے چائے پی تھی۔ کیسا
بھوک نہیں لگی۔ کھانا تیار ہے۔ بیو بچادوں بیو سجادوں یہیں؟"
خالہ اماں میرے بیگ میں بریانی اور شاہی ٹکڑوں کے پیکٹ ہیں۔ انھیں لے

جائیے اور یہ پانی گرم کر دیجئے۔" ناجیہ بولی اور خود اٹھ کر پرس بڑی بی کو تھما دیا۔

ہمیشہ ایسی ہی زحمت کرتی ہو تم ناجیہ۔" مدحت زہرہ بولیں،
اور باجی ابھی آپ نے کہا تھا کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس پر تن، من دھن نچھاور کرنے کے بعد بھی حسرت رہ جاتی ہے کہ کتنی زندگیاں اور ہوتیں تو وہ بھی نثار کر دیتے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میرا تن بیکار ہے۔ من آپ کو دیدیا اور دھن ہے نہیں۔ جو کچھ کرتی ہوں اس پر بھی شرم آتی ہے آپ اس کا تذکرہ دوبارہ نہ کیا کیجئے۔"
اچھی بات ہے وہ ہنس دیں۔ اور پلکوں کی جھالر اٹھا کے خالہ اماں کو دیکھا"
لے آئیے نا کھانا یہیں۔ آپ بھی ساتھ ہی کھا لیجئے۔ یہاں اتنی ٹھنڈی ہوا آتی ہے کہ اٹھنے کا جی نہیں چاہتا۔ اب تو پھر مغرب کی طرف سے بادل آنے لگے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شام تک کل کی سی بارش ہو گی۔"
ناجیہ بھی خالہ اماں کا ہاتھ بٹانے چلی گئی۔ ان تینوں نے مل کر نیم تلے ٹھنڈی ہواؤں میں کھانا کھایا۔ ناجیہ جائے بنا لائی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد مدحت زہرہ نے ناجیہ کے سامنے برسوں کا کھولتا ہوا لاوا نکال پھینکا۔

بے خطا مجھ سے روٹھنے والے میں تمہاری نہیں تو کس کی ہوں

ان کی نظریں سرسبز خلاؤں سے پچھلی یادوں کے سائے سمیٹ رہی تھیں۔
" لوگ جو کہتے ہیں کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے تو

سچ کہتے ہیں۔ ہم کوئی کہانی پڑھتے ہیں اور اس پر جھوٹ سچ کا لیبل لگا کے اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن جو ہم پر گذرتی ہے۔ اسے ساری زندگی نہیں بھول سکتے اور اس پر دماغی ہذیان کا لیبل بھی نہیں چسپاں کر سکتے۔ ویسے اگر محبت کرنے والوں کو زندگیوں اور داستانوں سے نکال دیا جائے تو پھر ان میں کوئی دلکشی نہ رہے۔

"جی۔۔" ناجیہ نے دم سادھے ہوئے کہا۔

کالج کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ ایک سنہرا دور ہوتا ہے۔ جو جاتا ہے تو پھر واپس نہیں آتا۔ چاہے انسان اس کے لئے مچل جائے۔ میں بی۔اے آخر کے آخری سال میں تھی۔ تب ایک نوجوان پروفیسر ہمارے معمر اور سن رسیدہ پروفیسر کی اتفاقی رخصت پر عارضی وقفے کے لئے انگریزی پڑھانے دوسرے کالج سے آیا تھا۔ وہ بہت خوبرو اور پرکشش تھا۔ اس کی متانت سنجیدگی اور لئے دیئے رہنے کا انداز ہی اس کا حسن تھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں ہی تھیں۔ لڑکے تک اسے پسند کرنے اسے چاہنے اور اس کے پیچھے پھرنے لگے تھے۔ خدا نے اسے مردانہ حسن و وجاہت کا پیکر بنایا تھا۔ میں نجانے کیوں ایسی حسن پرست بن گئی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے کشش کرتا تھا۔ اور تب شاید میں بھی اپنی ساتھیوں سے کچھ الگ اور منفرد شخصیت رکھتی تھی۔ میں بھی سنجیدہ اور محتاط تھی لیکن جب وہ میرے مقابل تو میری انفرادیت کا چراغ گل ہو گیا۔ میں خود کو بھول گئی اب میں اگر کالج جاتی تھیں تو صرف اس کی دید کی خاطر۔ اس کا لیکچر سنتی کہاں تھی۔ بس اس کا چہرہ تکا کرتی۔ اس کے خوشنما عنابی لبوں کو متحرک دیکھا کرتی جنہوں نے

میری لافانی محبت کے گیت گائے تھے۔ معلوم نہیں کیوں۔ سیکڑوں میں سے اس نے مجھے کیوں انتخاب کیا تھا۔ تقدیر کسی ایک ہی کو نشانہ بناتی ہے۔ سب کو نہیں۔ مگر میں تو ان دنوں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ ہر وقت مسکراتی اور اس شخص کی محبت پر مغرور تھی میں، اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ یہی لڑکیوں کی سب سے بڑی بھول ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو یاد رکھیں اور خود کو بھول جائیں۔ اور میں احمق اور ناسمجھ بھی تھی۔ اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔ اس کی محبت کی کھوکھلی نغمہ سرائی پر میرا دل جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ کتنے دنوں تک میں ایک عجیب سی خود فراموشی کی جنت میں سانس لیتی رہی۔ لڑکیاں میری خوش نصیبی پر رشک کرتی تھیں۔ وہ حسن و خوبی کا دیوتا جس نے میرے سجدہ دل کے لئے اپنے قدم پیش کر دیئے تھے کسی اور کا نہ تھا اور یہ میں سمجھ نہ سکی کہ انہی قدموں کی ٹھوکریں میرے سر کے نصیب میں لکھی تھیں!۔ میری دلبستگی میرے خاندان کے لوگوں کو معیوب لگتی تھی۔ ہمارے ہاں عشق و محبت کا نام بھی کسی کے لبوں پر نہ آتا تھا۔ نہ کہ میں صبح و شام اس غیر آدمی کی محبت کے راگ الاپتی تھی۔

میری منگنی میرے ایک رشتہ دار بھائی سے ہو چکی تھی۔ مگر چند ناگہانی حادثوں کی وجہ سے شادی نہ ہو سکی۔ پھر میری سبز قدمی کی افواہیں خاندان بھر میں عام

کی چاہت، کیسا خلوص، کس قدر سپردگی اور بے انتہا محبت ہوتی تھی اس کے لہجے
میں۔ مدحت زہرہ! اس آگ برساتے سورج، اس ٹھنڈی کرنیں لٹاتے ہوئے چاند
اور مسکراتے ہوئے ستاروں کی قسم، میں تمہارا ہوں، میں نے کون سی نیکی اپنی زندگی
میں ادا کی ہے جب مجھے تمہاری محبت ملی ہے، میں تو پہلی ہی نظر میں تمہارا ہو چکا تھا۔ اگر
تمہاری محبت مجھے نہ ملتی تو میں کیا کرتا، پاگل ہو جاتا، دیوانہ بنا پھرا کرتا، مدحت زہرہ!
وعدہ کرو مجھ سے کہ کبھی دامن کشاں نہ ہوگی، کبھی مجھ سے بے اعتنائی نہ برتو گی! مجھے
کبھی موت کے حوالے نہ کرو گی! وعدہ کرو۔"

اس نے اس کے ہاتھ میں اپنا کانپتا ہوا ہاتھ دے کر وعدہ کر لیا تھا،
قسم کھائی تھی!

نہیں احمد صاحب نہیں، اس طرح مت سوچئے، میں آپ کی ہوں، دنیا کی
کوئی طاقت مجھے آپ سے جدا نہیں کر سکتی۔

میرا ایمان جوان، میری وفا زندہ ہے

سورج مشرق سے نکلنا چھوڑ دے، سمندر اپنی روانی روک دیں، ہوائیں چلنا چھوڑ
کھلتے ہو جائیں، اندھی چاندنی مردہ ہو جائے، خاندان مجھے اور میں سارے
خاندان کو چھوڑ دوں، مگر میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ نوجوانی کا پاگل پن۔
جتنے دن میں نے خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین ہستی سمجھ کے گزارے تھے
لیکن مدحت کا نادان بننا پڑا، خاندانی محبت میں آبائی کا انجام اور جنت زخم کی
تھی۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب وہ محبت کرنے والا، چاہنے والا شخص مجھ سے
منحرف ہو گیا! سب سے بہت بعد کو احساس ہوا کہ مسرت کے بار آور ہونے کے لئے دولت
کی فراوانی بہت ضروری ہے، میرے پاس محبت تو بے شک تھی، وافر اور انمول خزانہ تھا

کھویا لمحہ

بیچا گیا
محبت کا، مگر وہ دولت نہ تھی جو ہیرے موتی، بنگلہ، گاڑی اور عیش و عشرت کا سامان
خرید سکے، اسے محبت کی حاجت نہ رہی تھی، وہ اس ہستی کی طرف پلٹ گیا جس نے
اسے سب کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور دے بھی دیا تھا، میں نے تب بھی اسے قصوروار
نہیں سمجھا، خود کو مجرم سی سمجھتی رہی، کیوں میں امیر کبیر اور شاہی خاندان سے نہ تھی
میں نے ناکامی محبت کی بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں، تب میں نے یوں مان لیا تھا
کہ میری محبت کی تقدیر میں بھی ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہے، پھر میری آہیں میرے آنسو
سب بیکار گئے! ناکامی کے داغ دل پر ایسے لگے تھے کہ میں بھلا نہ سکتی، اس وقت
تک میں اپنے چاہنے والوں کو بھی کھو چکی تھی، ماں، باپ چل بسے تھے، بہن بھائیوں
نے دور بستیاں بسالی تھیں، اب میں اپنی تمام حسرتوں اور پچھتاووں کے ساتھ تنہا اس لیے
جی رہی تھی کہ میری موت مجھ سے بہت دور تھی۔

پھر وہ بے ایمان، عہد شکن انسان کبھی پلٹ کے نہیں آیا میرے پاس، کبھی
نہیں، نہ جانے کن راہوں پر چلا گیا، کون سی منزل اپنالی، کس نے اسے اتنی
بے پایاں محبت دے دی کہ وہ اپنی پچھلی محبت کے ترانے بھول گیا۔

بڑی بری چیز ہے یہ محبت بھی، بہت بری ہے"

مدحت زہرہ کی آواز رندھ گئی ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے!
ناہید تو رو رہی تھی، اسے غیر شعوری طور پر اندازہ تھا کہ ان کی تنہائی اور اندوہ حرماں کا
راز محبت کی ناکامی ہی میں پوشیدہ تھا، مگر جب اس کا قیاس حقیقت میں ڈھل
گیا تو وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔

دوپہر بڑی اداس ہو رہی تھی۔ ہر طرف ایک اداس سناٹا منجمد تھا، اونچے اونچے
درختوں کے سائے سبزے پر دم بخود سو رہے تھے، ہلکی ہلکی ہوا ان کی چوٹیوں کو

بوڑھوں کے سر کی طرح ہلا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گھر کی دنیا میں قیامت کے بعد کا سناٹا چھا گیا ہو!"

ناجیہ بے حد اداس ہو رہی تھی، اس نے سوچا کہ کتابوں میں لکھا ہوتا ہے خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک انسان کی تباہی اور بربادی میں کون سی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔

وہ حمام ازل سے ایک محروم قسمت کیوں لائی تھیں، فکروں کا مجموعہ کیوں تھیں حرماں نصیبی کا مجسمہ کیوں تھیں، اگر ناجیہ کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی حسین محبوب کی عمر پچیس سال پہلے دائیں کھینچ لاتی، یا پھر دنیا کے آخری کونے سے اس بے وفا، عہد شکن اور سنگدل آدمی کو گھسیٹ لاتی جس نے مدحت زہرہ کی حیات شیریں میں زہر محبت گھول دیا تھا اور ان کی ساری زندگی کو زہراب بنا کے رکھ دیا تھا۔

دفعتہً انھوں نے کہا

"تم بڑی متاثر ہو رہی ہو ناجیہ! تم نے کئی بار اشاروں کنایوں میں مجھ سے میری اداسی، تنہائی اور بربادی کی وجہ پوچھی تھی، مگر میں نے جان بوجھ کے تم سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کیا فائدہ تھا اس سے، وہ چراغ جو ابھی تک میرے دل میں جھلملا رہا ہے، یکبارگی بھڑک اٹھتا، میری ہستی کو بھی جلاتا اور تمہیں بھی، تکلیف پہنچاتا۔ میری تمہارے آنسوؤں کا سبب بن گئی ——— مجھے اس کا افسوس ہے بہت افسوس ہے میری چھوٹی دوست!"

"میں آپ کیلئے کچھ نہیں کر سکتی باجی! صرف رو سکتی ہوں، مجھے آپ رونے سے منع نہ کیجیے، دل پھٹ جائے گا میرا!"

"دل پر سے اس بوجھ کو ہٹا دو! اور بس ایک بات یاد رکھو کہ کسی سے کبھی متاثر

نہ ہو، کبھی کسی سے محبت نہ کرو ۔ کبھی کسی کی محبت پر ایمان نہ لاؤ "۔

وہ چپ رہی مگر رنج و غم اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔

"کوئی اور بات کرو ناجیہ! بیکار کی پرانی باتوں میں خواہ مخواہ وقت خراب ہو گیا۔" انھوں نے کہا، پھر بولیں "ہاں تم نے زاہدہ کی شادی میں جانے کا ذکر کیا تھا، گئیں ؟"

"جی ہاں! وہ تو تبھی ہو گئی، میں شریک بھی ہوئی تھی اس کی شادی میں"۔

"وہ لوگ تمہاری مدد کے لئے ممنون بھی ہوئے ہونگے!"

"اس کا میں نے موقع ہی نہیں دیا تھا باجی! جب بھی وہ لوگ میرا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ ڈھونڈتے، میں دوسرا ذکر کرنے لگتی تھی"۔

"بہت بلند اور عالی ظرف ہو تم!"

"بس میں دوسروں کی مجبوریاں نہیں دیکھ سکتی! سوچتی ہوں اگر ایسی مجبوری مجھے ہوتی اور میرا کوئی مددگار نہ ہوتا تو کیا ہوتا"۔

"تمہاری بہن کا بیاہ کب ہے؟" انھوں نے خود ہی دوسرے موضوع چھیڑے

"پندرہ دن بعد، چچی جان آ کے تاریخ لے گئیں"۔

"تو وہ جرمنی چلی جائیں گی؟"

"جی ہاں! بہت خوش ہیں باجی! کیسی عجیب و غریب ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو شادی بیاہ سے خوش ہوتی ہیں اور یہ نہیں سمجھتیں کہ مرتے دم تک کے لئے وہ ... کی زنجیریں پاؤں میں پڑ جائیں گی اور ایک شوہر نما حاکم سر پر مسلط ہو جائے گا۔ سچ مانئے کہ شادی کے نام سے مجھے ... ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ ایسی کوئی نوبت آنے سے پہلے میں مر جاؤں"۔

"خدا نہ کرے! خود کو ایسی بد دعا نہ دو۔" انھوں نے کہا "شادی بیاہ کرنے کی تاکید تو مذہب میں بھی ہے اور شادی ایک معاشرتی ضرورت بھی ہے اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا صاف ستھرا خاندان اور ہمارا معاشرہ بدعنوانیوں اور سماجی خرابیوں اور گمراہیوں کا گڑھ بن کے رہ جائے۔"

"میں اس چیز کو مانتی ہی نہیں!" ناجیہ بولی

"کیوں نہیں مانتیں؟"

"کیا شادی شدہ مرد اور عورتیں بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتے، شادی کون سا تحفظ ہوتی ہے ان کیلئے؟"

"پھر بھی وہ ایک حد میں رہتے ہیں" انھوں نے کہا "کیونکہ ان کے سارے قدرتی اصولوں کی پابجائی کے لئے ذریعے موجود ہوتے ہیں، اور نتیجے میں وہ شتر بے مہار نہیں ہوتے۔"

"آپ گذار لائیں! باجی پچیس برس بڑے سکون کے ساتھ!"

"خود کو چھلتے، پھ بنلاتے ہوئے ناجیہ، سکون کے ساتھ نہیں"

"تو آپ بھی اس بے وفا سے شادی کر لیتیں اگر وہ کہتا۔"

"ضرور کر لیتی اگر وہ کہتا اور میں نے خود کو تباہ کس لئے کیا تھا۔"

"باجی! اگر وہ اسے بھولا لمحہ کا آپ کے پاس واپس آجائے تو پھر؟" ناجیہ نے پوچھا۔

"ماضی کبھی واپس نہیں آتا ناجیہ!"

"پھر آپ اس بدشگن کو یاد کیوں کرتی ہیں؟"

"میں جان بوجھ کے یاد نہیں کرتی معلوم نہیں ناجو! دماغ کا کون سا دروازہ

ایسا ہے جس سے یادیں اندر چلی آتی ہیں اور نکالے نہیں نکلتیں، بہت تنگ کر ہوتی ہیں یہ یادیں، ہوشمند رہ کے غم سہنے سے بہتر ہے کہ آدمی پاگل ہو جائے۔"

"میں نے تو قسم کھائی ہے باجی! میں عمر بھر شادی نہ کروں گی۔"

"تم ناسمجھ ہو، تمہارے سامنے لمبی زندگی ہے اور اس زندگی کے کیا کیا نشیب و فراز ہیں تم نہیں جانتیں، زندگی کے طویل راستوں پر چلنے کیلئے ایک ہمراہی کی ضرورت لازمی ہے ناجیہ! جو اپنا ہاتھ تھامے اور منزل تک ہو جائے، ہر عورت کا نصیب یہی ہے، اپنا گھر، اپنا شوہر اور بچے، عورت ان کے بغیر اپنی زندگی میں نامکمل ہوتی ہے۔"

"کتنا حسن ہے نامکمل رہنے میں" ناجیہ نے کہا "عورت اگر مکمل ہو جائے تو پھر زندگی منجمد ہو جاتی ہے، اس کی دلکشی، جاذبیت اور کشش شوہر صاحب اور چھ سات بچے مل کر وقت سے پہلے ختم کر دیتے ہیں، مجھے نہیں چاہئے ایسی مکمل زندگی۔"

"تمہارے ماں باپ ہیں، کنبہ ہے تم کیا ان سب سے مقابلہ کی ہمت رکھتی ہو" انھوں نے کہا "تمہارے جیسی باغی لڑکیاں کہ ایسی لڑکیوں سے ناساسب کہانیاں منسوب ہو جاتی ہیں، رسوائیاں ان سے لپٹ جاتی ہیں، کوری زندگی پر داغ لگتے ہیں، نہیں تمہاری قسم اچھی نہیں، اس کا کفارہ دو اور وعدہ کرو مجھ سے کہ جب ایک خوبصورت، خوش رنگ زندگی تمہاری طرف پیش قدمی کرے تو تم اس کا خیر مقدم کرو گی!"

"مجھ سے اگر آپ یہ کہیں کہ ناجیہ! تم میرے قدموں پر جان دیدو تو میں بڑی آسانی سے ایسا کر سکتی ہوں مگر میں آپ کا یہ حکم کہ ناجیہ تم شادی کر لو میں

کبھی نہیں مان سکتی۔"

"کیوں بھئی ؟" وہ ہنسنے لگیں

"مجھے مردوں سے سخت نفرت ہے" ناجیہ بولی "ان کی عورتوں سے برتری طاقت، تحکم اور تسلط کا خیال کرتی ہوں تو تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے، میں تو اپنے باپ ہی کا حکم نہیں مانتی، شوہر کا کیا مانوں گی، اور خدا نے اس کا بڑا مرتبہ بنایا ہے، میں اس کی نافرمانی ہو کے گناہ گار بننا بھی نہیں چاہتی ہوں، اب سمجھیں آپ۔"

"یہ درجہ بندی تو خدا ہی نے کر دی ہے، دونوں کے فرائض اور مراتب الگ الگ ہیں ان میں ذہنی سمجھوتہ ہو جائے تو جنگ زرگری بھی نہ ہو" انھوں نے سمجھایا

"یہ ناممکن سی بات ہے، آپ کو میں بتاؤں" ناجیہ نے سنجیدگی سے کہا "میرے والدین کی شادی کو بھی ایک ربع صدی گزر چکی ہے، چند دنوں بعد وہ نانا نانی بن جائیں گے مگر ان میں ابھی ایک ذہنی مفاہمت ابھی تک نہ ہو سکی، والد صاحب جج ہیں، والدہ صاحبہ پروفیسر ہیں، دونوں معتبر ہیں، سنجیدہ ہیں اور اپنے اپنے فرائض اور مرتبے بھی پہچانتے ہیں، لیکن معمولی سی بات پر بھی جب والد صاحب کا پارہ ہائی ہو جاتا ہے اور زبان بے قابو ہو جاتی ہے تو پروفیسر بیوی بے بس ہو کے پھر بھر کے آنسو بہاتی ہے۔

مرد اپنی فطرت سے مجبور ہے، اپنا حاکم ہونا اپنی برتری اور اپنا طاقتور ہونا وہ کبھی بھول نہیں سکتا، اب آپ سے کیا کہوں، باتوں باتوں میں ایک دفعہ ان نے کہا کہ ڈیڈی نے کسی بات پر بگڑ کے ان کو ایک ہاتھ رسید کر دیا تھا اور امی رو دھو کے میکے چلی گئی تھیں۔"

"ہٹو! جھوٹ!" وہ زخستہ ہنس پڑیں

ناجیہ بھی ہنسنے لگی۔

"جی ہاں! جھوٹ نہیں، ڈیڈی رات گئے کسی فنکشن سے گھر آئے تھے، تھکے تھے انھوں نے بیل بجائی، آوازیں دیں مگر دیر تک کسی نوکر نے دروازہ نہیں کھولا سب پڑے سو رہے تھے، کوئی آدھ گھنٹے بعد اُمی نے دستک سنی اور بھاگ کے دروازہ کھولا، ڈیڈی کھڑے کھڑے آتش فشاں بن چکے تھے، دروازہ کھلتے ہی امی پر ہاتھ رکھ دیا اور یہ بھی کہا کہ میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی مر گئیں!"

"ان کا غصہ بجا تھا بھئی!" وہ بولیں "بچارے تھکے ہارے آئے تھے آرام کرنا چاہتے تھے، دیر تک، دروازے پر کھڑے رہنا پڑے تو آدمی کو غصہ کیسے نہ آئے گا؟"

"جی ہاں! مگر غصہ مرد ہی کو آیا امی نے کڑک کے پوچھا کہ تم کہاں مر گئی تھیں غصہ عورت کو نہیں آیا ورنہ گرج کے یہ نہ پوچھ سکی کہ اتنی دیر رات تک تم کہاں تھے اور کہاں مر گئے تھے!"

"اف ناجیہ! ختم کرو، تم بہت خطرناک ہو۔" انھوں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا "عمر کے ساتھ ہی ساتھ تمہارے جارحانہ خیالات اگر پختہ ہو گئے تو کیا ہوگا!"

وہ ہنس کر چپ ہو گئی،

"اچھا اب اٹھو، ظہر کی اذان ہو چکی ہے" مدحت زہرہ بولیں "ٹھنڈے پانی سے وضو کرو، نماز پڑھو، تاکہ تمہارا غصہ دھیما پڑے"!

ناجیہ ہنس کر کھڑی ہو گئی، پھر بولی،

"یہ تو بتائیے! باجی کی شادی میں آپ آئیں گی نا! کل پرسوں کارڈ بٹنے شروع

ہو جائیں گے، مگر آپ کو کارڈ کی کیا ضرورت ہے آپ تو اپنی ہیں۔"

"نہیں ناجو! مجھے معاف کر دو! میں کسی شادی میں نہیں جاتی، میرا دل بہت کمزور ہے، دلہن کی رخصتی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، میرے دل پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتی" ناجیہ نے کہا "مگر باجی آپ کا دل کمزور کیوں ہو گیا ہے؟"

"پینتالیس سال سے بچارہ مسلسل دھڑک رہا ہے غریب، یہی غنیمت ہے چلتے چلتے کمزور نہ ہو جائے گا" انھوں نے کہا

"خدا کرے کہ سو سال اور دھڑکتا رہے!" ناجیہ نے دعا دی

"ناممکن سی دعا ہے، قبول نہیں ہوگی" وہ ہنستی ہوئی غسل خانے کی طرف بڑھ گئیں، ناجیہ کے دل پر ان کی غم ناک کہانی دھند بن کر منڈھ گئی تھی۔ وہ دکھاوے کو ہنس بول رہی تھی، ان کے ساتھ نماز پڑھی، اور ان کے پاس لیٹ کے سونے کی اداکاری بھی کی، مگر وہ روز کی سی خوش نہ تھی۔

کس سے شکوہ کریں گلہ کس سے
غم سے بوجھل ہے دل قرار گیا

عذرا کی شادی کے دن بہت قریب آ گئے تھے، دور و نزدیک کے مہمانوں کی آمد جاری تھی، گھر کی چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا، کوٹھی خود بھی دلہن بنی تھی اس پر مدھم چمکیلا نیلا رنگ کرایا گیا تھا جو دیکھنے والوں پر ایک نشہ طاری کر دیتا۔ آج کل بجلی والے ننھے منے رنگین قمقموں سے گھر کے اندر باہر اور باغ میں وائر لگاتے پھر رہے تھے، لان پر خوش رنگ خیمے لگے تھے۔ باورچیوں کے انتخاب ہو رہے تھے، روز خریداری ہو رہی تھی، مگر ان سے ساری مصروفیتوں سے ناجیہ بالکل الگ تھی۔ اسے نہ اپنی بہن سے ہی محبت تھی اور نہ ان کی شادی سے دلچسپی تھی، گھر کی دوسری مہمان لڑکیاں بڑے شوق سے کوٹھی کی سجاوٹ میں حصہ لے رہی تھیں، کئی ایک تو عذرا کی دوست اور کچھ ان کے ساتھ کی نو عمر لیکچرار تھیں، لیکن ان میں شوخی، مذاق اور گانا بجانا بالکل نہیں تھا وہ سب کی سب بہت سنجیدہ تھیں ان میں باتیں بھی پتھر کی سی ٹھوس ہوتی تھیں جن میں نام کو نرمی لوچ اور رس نہ تھا،

"تمہارے ہزبینڈ کیا ڈاکٹریٹ مکمل کرنے کی اجازت نہ دیں گے؟"
ایک محترمہ کہتیں جن کے نزدیک شادی سے تعلیم اہم تھی،

"کیا آپ کو علم نہیں کہ عذرا شادی کے بعد برنی چلی جائیں گی" دوسری یہ اطلاع سنسنی

اب کب ملنا ہوگا عذرا سے خدا جانے "

"بھئی اب تو کسی کا پابند ہونا پڑے گا!"

"عجیب ہوتا ہے اس شخص کا حکم جسے دنیا والے شوہر کا خطاب دیتے ہیں"

"عورت چاہے لاکھ تعلیم یافتہ ہو جائے، وہ ایورسٹ فتح کر لے، چاند کو مسخر کرے، گورنر منسٹر یا کسی ملک کی فرمانروا بن جائے مگر رہے گی مرد کی محکوم، خدا غارت کرے"

"کاش میں مرد بن جاتی"

"اے عذرا! یہ کیا، تم تعلیم یافتہ، روشن تہذیب کی پروردہ ہو، یہ سر جھکا کے کیوں بیٹھ گئی ہو، ہم کوئی نئے تو نہیں تمہارے لئے، سر سے آنچل تو ہٹاؤ، فری ہو کے بیٹھو اور مزے سے باتیں کرو"

"تعجب ہے کہ روشن تہذیب اور اعلیٰ تعلیم نے مجھے نڈر اور بے باک نہیں بنایا" سب کی سننے کے بعد عذرا نے کہا "جب تک شادی کا صرف ذکر ہی ذکر تھا، میں نے کوئی اہمیت نہ دی مگر اب سر پڑ گئی تو ڈر لگ رہا ہے، کیا ہوگا جب میں اجنبی لوگوں میں اور اجنبی ملک میں جاؤں گی ... کو چھوڑ کے، جہاں سے جلدی آنا جانا معلوم، بس دن رات سوچتی رہتی ہوں، ... لڑکی بن کے رہ گئی ہوں کہ اگر ڈیڈی کمرے میں آجاتے ہیں تو سر اٹھا کے ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، تم مجھے روشن خیال اور نئی تہذیب کی پروردہ نہ کہو یہ تو ہم مشرقی لڑکیوں نے بے حجابی کا ایک کمزور خول خود پر چڑھا لیا ہے، اندر سے ہم وہی اور

بالکل دبی چھپی، شرمیلی اور ڈرپوک لڑکیاں ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ کہیں اب جا کے ہوا ہے!"

"سنا ہے کہ دولہا میاں نکاح سے پہلے ہی سسرال کے پھیرے کرنے لگے ہیں"
"وہ کوئی غیر تو ہیں نہیں، جج صاحب کے رشتے کے بھتیجے ہوتے ہیں۔"
"یہ ہیرا پھیری کس کی دید کی خاطر ہوتی ہوگی؟"
"جی معاف کیجئے باہر ہی سے رخصت ہو جاتے ہیں، جس کی دید کی خاطر سے بھاگ کے آتے ہیں وہ سات پردوں کے پیچھے ہے۔"
"ارے تو نقاب کشائی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں؟"
"دولہا میاں کی زیارت ہمیں بھی کوئی کرا دیتا۔"
"دل سوس رہا ہے، ایک ساتھی جدا ہو رہا ہے ہم سے۔"
"اسی لئے تو جی چاہتا ہے کہ ؎

غنیمت جانئے مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

"تم لوگوں کا کیا ہے"، عذرا نے کہا "سب ساتھ ہی رہو گی، یہی دن رات رہیں گے، یہی دلچسپیاں رہیں گی، مگر میری حالت پر غور کرو میں سب سے جدا ہو رہی ہوں گی نہ یہ شام و سحر ہوں گے، نہ یہ دلچسپیاں، ہیں کس طرح بے کل ہو رہی ہوں سب کیلئے۔"
"بیگم صاحبہ! یہ تو صرف زبان سے کہنے کی باتیں ہیں، تمہیں منہ دیکھی باتیں کہتے ہیں، دل میں تو ارمانوں کے میلے لگے ہوں گے، شادی کے بعد شوہر سے زیادہ عزیز اور محبوب دوسرا کوئی نہیں ہوتا۔"
"بھئی: تجربے کی بات کہی ہے۔"

عذرا کی سہیلیاں بات چیت میں لگی تھیں اور عذرا خاموش سر جھکائے سوچ رہی تھیں، انھیں جلد ہی اس گھر سے رخصت ہونا تھا، ان کے جانے کے بعد سب سے زیادہ انھیں جج صاحب یاد کریں گے انھیں بہت چاہتے تھے،

کیا تقدیر ہوتی ہے لڑکیوں کی بھی خدایا، پیغمبر کی بیٹی ہو کہ بادشاہ کی، امیر کی ہو کہ گدا کی مقدر سب کا ایک سا ہوتا ہے، پیدا ہوئی باپ کے گھر دوسروں کی ملکیت کا ٹھپہ لگا کے اور ختم ہوئی شوہر کے گھر میں بری بھلی جیسی بھی گذرے اس کی قسمت!

"عذرا! ارے یہ کیا، تم رو رہی ہو؟"

"تمہاری بھی باتیں، میکے سے جدائی کا غم تو ہوتا ہی ہے اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"مگر تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ ـــــ"

"ان کے احساسات مردہ ہو جاتے ہیں کیا خوب کہی!"

"ان کے احساسات تو اور بھی تیز ہوتے ہیں اور جاندار ہوتے ہیں، بڑھا چڑھا کے دکھ پہونچاتے ہیں۔"

"ختم کرو بھائی اب یہ رنجیدہ ذکر، دوسری باتیں کرو، میرے دل پر بھی خواہ مخواہ اثر ہو رہا ہے ڈر ہے کہ کہیں یہ شادی کی بزم خدانخواستہ آہ و بکا میں نہ بدل جائے ابھی دیکھ کے آرہی ہوں، خالہ امی بھی اداس سی بیٹھی ہیں، ان کا دل کیا کہتا ہوگا" ہائے ـــ!

زار و زاری مری سکھیاں رو رہیں
ہوئی چلنے کی مری تیاری

ایک شاعر کیسا پگھلا ہوا شعر کہا ہے ؎

رہے آباد ترنجن تیرا
سدا تو نہ رہے گی میکے "

ایک خاتون نے آگے بڑھ کے کیسٹ آن کر دیا اس میں شاید ناجیہ نے پہلی ہی
بار کا گیت ریکارڈ کروا دیا تھا۔

چلی بن کے دلہن، ان سے لاگی لگن
مورا میکے میں جی گھبراوت ہے

جب سب کی پلکیں بھیگنے لگیں تو دوسری محترمہ نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا
اور سب خاموش ہو کر عذرا کی سسکیاں سننے لگیں۔
پھر جب اگر کسی کو عذرا کی شادی کی چھپی ڈھکی خوشی تھی تو بیگم کو تھی ویسے وہ
خود کو اداس ہی پوز کر رہی تھیں۔
مگر حقیقی افسردگی جج صاحب کے دل پر پڑ گئی تھی، سارا انتظام انھوں نے کر
دیا تھا لیکن نہایت بجھے دل سے، جب سے یہ رشتہ چھوٹا تھا وہ اپنے کمرے میں گم صم
بیٹھے رہتے، آنکھوں سے نہ جانے کیا غم جھانکتا اور سامنے دیوار کو یوں دیکھتے
جیسے وہاں کوئی پوشیدہ تحریر لکھی ہو ماضی کی دلکش یا دلخراش کہانی۔
وہ ایک بڑے خوشحال کنبے کے فرد فرید تھے، ان کا خاندان تعلیم یافتہ تھا اور
سارے ہی افراد ہنس مکھ اور زندہ دل اور مجلس پسند تھے، جج صاحب خود بھی
ایسے ہی تھے گویا منہ پھرنے کے رسیا، خوش مزاج، یہاں محفل کی قسم کے آدمی
رنج و غم سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ جانتے بھی نہ تھے کہ اس دنیا میں
کہیں آنسوؤں کا بھی وجود ہے وہ بہت ہی زندہ دل تھے، انھیں لطیفے بہت زیادہ
پسند تھے اگر تنہائی میں بھی کوئی لطیفہ یاد آیا تو یہ خیال کئے بغیر کہ کوئی کیا کہے گا وہ

بلند آواز سے ہنسنے لگتے تھے

پھر اچانک انکی زندگی میں ایک اندوہناک موڑ آگیا، ایسا موڑ جس نے ان کی زندگی ہی بدل کے رکھ دی، اور وہ دوسری ہی راہ پر چل پڑے، اچانک ایک ہستی ان کی خوش رنگ زندگی میں آگئی تھی۔ بے سان گمان، جس سے اگر انھوں نے گہری محبت کی تھی تو اس نے بھی ہمہ تن ایک دل بن کے انکو چاہا تھا۔ ان میں عہد و پیمان ہوئے تھے، ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور انھوں نے جائز طور پر ایک دوسرے کا ہو کر رہنے کا عہد کر لیا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ زبردستی جدا کر دیے گئے، انھیں یہ تو علم تھا کہ ان کی ماں نے اپنی [illegible] سہیلی کی لڑکی سے انکی بات پختہ کر رکھی تھی، کیونکہ وہ غیر معمولی دولت مند خاندان کی [illegible] تھی اور جج صاحب کی ماں کچھ زر پرست تھیں، انھیں ایک اعلیٰ درجات پسند [illegible] جہاں پر دولت کی اتنی ریل پیل تھی کہ چھوٹی سے چھوٹی خواہش اپنی تکمیل کو [illegible] نہ رد جائے۔ جب ان کو علم ہوا کہ جج صاحب نے کہیں اور دل کا نذرانہ پیش کر دیا [illegible] کے غم و غصہ کا ٹھکانا نہ رہا، وہ سخت گیر بھی بہت تھیں، ایک [illegible] کی طرح [illegible] کھا کے سو رہنے کی دھمکی دی تھی، اور وہ ایسا خطرناک اقدام کر بھی [illegible] دھمکی میں آ گئے اور خود کو ماں باپ کے سپرد کر دیا، ان کی [illegible] ایک امیر کبیر کی بیٹی بیاہ لائیں خود اپنا دل خوش کیا۔ لوگوں میں ناک اونچی رکھی، ہر ایک سے واہ واہ کی داد بھی سمیٹی اور پھر خوشیوں کا تاوان اس طرح دیا کہ [illegible] سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں۔ اور ایک رات سوئیں تو سوتی ہی رہ گئیں، خود تو دنیا سے سدھاریں مگر اپنے ہنس مکھ خوش مزاج اور زندہ دل بیٹے کو سدا کے لیے غم پنہاں کے حوالے کر گئیں، شادی کی رات ہی سے جج صاحب اداسیوں اور پچھتاووں کے ہو کے رہ گئے تھے لیکن وہ

نوجوان تھے، خوبرو اور پرکشش تھے، ایک بڑے عہدے پر تھے، دولت کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ دونوں ہاتھوں سے روپیہ پھینکتے تو بھی کم نہ ہوتی، قدرت نے دل کھول کے انکو نوازا تھا، کوئی کمی نہ تھی، مگر قدرت نے غم دسرت کا بیلنس بھی ترازو رکھا تھا، اگر انھیں بے تحاشہ دولت دی تھی تو دل کا سکون، قلبی راحت اور حسنی خوشی چھین لی تھی، پھر کبھی ان کے لبوں پر وہ مسکراہٹ نہ آسکی جس کا تعلق دل کی خوشی سے ہوتا ہے ویسے وہ اعلیٰ طرز زندگی کا قابل رشک نمونہ تھے، ایک شاندار کوٹھی میں فروکش تھے، گھر پر گاڑیاں، خدم وحشم۔ نوکروں کی فوج آگے پیچھے اولاد سے بھی نوازا گیا تھا۔ بظاہر کوئی غم نہ تھا مگر کوئی پوچھتا کہ اتنی قدر عیش وآرام کے باوجود آپ خوش ہیں تو ان کا جواب ہوتا کہ "نہیں!"

ایک خلش تھی بہت پرانی، جو دل میں پھانس کی طرح چبھ رہی تھی۔ ایک غم تھا، ایک دکھ تھا جو تنہائیوں میں آنسو بن کر بہتا اور ان کے تکیے میں جذب ہو جاتا تھا لوگ انکی بظاہر آسودہ مسکراہٹ دیکھتے تھے، غم پنہاں کے راز دار وہ خود تھے۔ پھر کبھی وہ زندگی کی کسی ساعت سے سکون کا ایک لمحہ بھی۔ خرید سکے وہ کشیدہ لمحات جو دوسروں کے لئے باعث تسکین وراحت تھی ان کے لئے وجہ سکون نہ بن سکی، وہ دولت جس کے لئے وہ صلیب پر چڑھے تھے روز بروز ترقی پر تھی اور دکھ کی وہ میخیں جو ان کے دل اور ہاتھ پاؤں میں گڑی تھیں روز بروز ان کے جسم میں گہری اترتی جارہی تھیں، لیکن انھیں منھ سے اف کا یارا تھا نہ ان کی مجال تھی کہ ایک ہلکی سی کراہ بھی لبوں پر لا سکتے، ان کا ساتھی نصیب بد قسمت، ان کا ساتھی دولت مسند مقدس ایسا ان کی نظر میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا،

انھوں نے اپنے درد دل کے علاج کیلئے کیا کیا نہ کیا تھا دوستوں کی صحبت میں بیٹھے

رہے تھے، معمولی معمولی مسائل میں دل کی گہرائیوں سے حصہ لیا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر قہقہے لگائے تھے، گھرداری میں حصہ لیا تھا، بیوی سے ایسی محبت کی کہ وہ گھبرا گئی بچیوں سے ایسا پیار کیا کہ وہ بیزار ہو گئیں، دنیاداری میں ایسے جٹ گئے کہ بچے دنیادار ہو گئے، پھر مذہب کا سہارا لیا اور تہجد گزار ہو گئے ــــــ مگر بے قرار دل کو کبھی قرار نہ آیا۔

وہ خلش جو درد مستقل بن چکی تھی، مٹ نہ سکی

وہ پھانس جو دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی سکون میں نہ بدل سکی۔

وہ بے چینی جو لازمۂ حیات بن گئی تھی، سکون میں نہ بدل سکی

تخیل کی تنہائی بڑھتی ہی گئی، زندگی چپکے چپکے گردن میں ڈھلتی رہی اور زمانے کے بے آواز قدم آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

اور اب انکی عمر کا سورج ڈھل چکا تھا،

زندگی ایک ڈھرے پر آکے رک گئی تھی

مگر پرانی یادوں کے تیل سے لبریز چراغ تھا محبت کا جوان کے دل کے نہاں خانے میں جوں کا توں روشن تھا، وہ یادیں کربناک تھیں اور اس روشنی میں اتنا اندھیرا تھا کہ وہ گھبرانے لگے تھے۔

گھر کے اندر اور باہر ایک شور بے ہنگام برپا تھا

کسی منچلے نے گیٹ پر روشن چوکی رکھ دی تھی، وہ صبح بعد نماز ہی نہایت ہی درد انگیز آواز میں بجنے لگی، شہنائی کا تو کام ہی ہے کہ وہ پیا ملن کے ترانے گائے مگر اس کا دل خراش ترانہ انھیں رہ رہ کے رلا رہا تھا اور وہ اس طرح سے کئی بار رو چکے تھے۔

اپنی بیٹی کی جدائی پر نہیں :
اپنی بے بسی اور بیکسی، اور اپنی ذات کی کھوکھلی تنہائی پر جس کا کوئی رازدار اور چارہ ساز نہیں تھا، اپنی دلجوئی اور غم خواری آپ کرتے، وہ تھکے جا رہے تھے، مگر دل کے اندر موجزن آنسوؤں کے سمندر کو آنکھوں کی راہ بہا کے بھی ان کو سکون نہ مل سکا، وہ بے قراری جو حیات ثانیہ بن چکی تھی، ان کی ذات سے کبھی دور نہ ہو سکی ـــــــ

دن کے دو بج چکے تھے، لنچ کے لئے ان کا ملازم باسط اطلاع دیکر جا چکا تھا اندر گھر میں ہلچل زیادہ ہو رہی تھی، نہ جانے کون کون سی خواتین کہاں کہاں سے آگئی تھیں ان کے ساتھ بچے بھی تھے، نوجوان لڑکے لڑکیاں تھیں، ان سب کا اور ان کی آوازوں کا ایک آہنگ مسلسل تھا جو جج صاحب کے اعصاب کیلئے چیلنج بنتا جا رہا تھا وہ چاہتے تھے کہ باہر نکلیں اور ایک گرجدار ڈانٹ میں سب کو خاموش کر دیں، مگر وہ خواتین ان کی بیگم کی عزیز اور سہیلیاں تھیں، یہ ناممکن تھا کہ وہ ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ سکتے یہ البتہ ممکن تھا کہ خود ہی گھر سے چلے جاتے، مگر یہ بھی ناممکن ہی تھا، ان کی باریابی بیگم کے حضور میں ضروری تھی: رہ رہ کے ان کی آہنی تجوری کھل رہی تھی، بند نہیں ہو رہی تھی۔

"سرکار!" ملازم نے ڈرتے ڈرتے پھر گھگھیا کر کہا "بیگم صاحب کہہ رہی ہیں کہ لنچ لگا دیا، آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

"باسط!"

"جی حضور!"

"سلونیاں؟ کون ہے کھانے کے کمرے میں؟"

"سرکار! نئے لوگ ہیں وہاں کہ میں کسی کو بھی نہیں جانتا"

"اچھا تو بیگم صاحبہ سے نمبر لو میرا کھانا یہیں بھیج دینا!"

"جی اچھا!"

پانچ منٹ بعد بیگم تیز تیز قدموں سے باہر پہنچیں، ان کے جسم پر زرد رنگ کی نفیس قیمتی ساڑی تھی ڈھلتے جسم پر چست بلاؤز تھا، کانوں میں جگ مگ کرتے ہیرے کے ٹاپس، ناک میں یاقوت کی خوشنما کیل، گلے میں خوبصورت سا چندن ہار کلائی میں سونے کی چوڑیاں اور انگلیوں میں سچے نگینوں کی انگوٹھیاں، حقیقت یہ ہے وہ سونے سے لدی تھیں، چہرہ مسرور کن احساسات کا آئینہ دار، آنکھیں چمک رہی تھیں، ان کا خیال تھا کہ جج صاحب بھی سب دستور قیمتی لباس پہنے بیٹھے ہوں گے مگر انہیں حیرت سی ہو کے رہ گئی، وہ رات کا لباس پہنے ہوئے تھے، گالوں پر داڑھی پھیل رہی تھی، چہرہ بھی شگفتہ نہ تھا لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی

"کیا ہوا ___؟" بیگم نے تعجب سے پوچھا "آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں، کیا اللہ نہ کرے، جی کچھ خراب ہے؟"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں!"

"تو پھر ایسے کیوں بیٹھے ہیں، نہ آپ نے داڑھی بنائی، نہ نہایا، لباس تک نہیں بدلا، نجانے کب سے اس طرح اکیلے بیٹھے سوچ رہے ہیں، دو تین بار بلایا آپ کو کھانے کیلئے، کیوں نہیں آئے، میری ساتھی پروفیسر اور لیکچرر آپ سے ملنا چاہتی ہیں: کھانا یہاں کیوں منگا لیا ہے، چلئے نا اندر، سب کے ساتھ کھائیے!"

"اتنے سوال تم نے یکبارگی پوچھ لئے ہیں کہ میرے لئے جواب دینا مشکل ہے!" جج صاحب بولے "فکر مت کرو میں بالکل ٹھیک ہوں، تمہاری پروفیسر ساتھیوں سے

کئی بار مل چکا ہوں، اب ملنا نہیں چاہتا، اس کے ساتھ کھانا بھی نہیں چاہتا ہوں
لہٰذا میرے لئے یہیں بھجوا دو۔ اگر تم کو منظور ہو تو!"

"آپ کی تو عجیب باتیں ہوتی ہیں" بیگم تنک کر بولیں "صاف صاف کہئے کہ
عذرا کی شادی کا غم ہے آپ کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ابھی اس کی شادی ہو، مگر
ہو رہی ہے اسی کا غصہ ہے آپ کو، میں جانتی ہوں۔"

"جب جانتی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو" جج صاحب نے کسی مروت یا لحاظ کے بغیر کہا۔
"اب جاؤ وہ سب تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"شادیاں اولاد کی تو کرنی ہی پڑتی ہیں" بیگم نے کہا

"کیا میں نے کبھی کہا ہے کہ تم اولاد کی شادیاں مت کرو" جج صاحب بولے

"تو پھر کیوں اس طرح خاموش اور مغموم بیٹھے ہیں" بیگم نے بڑی دردمندی سے
کہا "اندر چلئے۔ سب میں ہنسئے بولئے، آپ کو سنجیدہ اور چپ دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگتا
ہے اور میں بھی اداس ہو جاتی ہوں۔"

"نہیں بھئی! تم اداس مت ہو" جج صاحب نے دل ہی دل میں بیزار ہو کر کہا "تم
تو جانتی ہی ہو کہ اکثر ایسی اداسی کے دورے پڑتے ہیں مجھ پہ، تھوڑی دیر بعد خود بخود ٹھیک
ہو جاتا ہوں۔"

"ہائے اللہ! کب ختم ہوگی آپ کی اداسی؟"

— "جان کے ساتھ جائے گی"

بھونچال کی طرح نادیہ کمرے میں گھس آئی اور سخت نامناسب انداز میں بولی
"واہ امی واہ، کھانے کا مزہ بچھلی باز رہنا ہوا ہے، آپ ڈیڈی کو بلانے کو
آئیں تو یہیں کی ہو گئیں۔ چلئے وہ محترمہ بیگم سرفراز بلا رہی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ

اس کے بیٹے میں جو ہے بلیاں سب دوڑ رہے ہیں! چلیے "
جاتے جاتے بیگم نے مایوس آواز میں جج صاحب سے پوچھا " تو پھر آپ کیلئے یہیں بھیجدوں! "

" ہاں! " جج صاحب نے کہا اور غسلخانے کی طرف بڑھ گئے۔ نادیہ ان کے پیچھے گئی اور جب وہ منھ ہاتھ دھو کر کمرے میں آئے تو سر اٹھا کر ان کا چہرہ تکنے لگی وہ ٹہلنے لگے۔

"کیا بچھڑی ہوا اس طرح؟"

" ڈیڈی آپ اداس اور رنجیدہ ہیں؟ "

ہاں بیٹی " وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ نادیہ قالین پر ٹک گئی۔

"کیوں؟"

" بیٹی کی شادی ہو رہی ہو۔ اس کی جدائی قریب ہو تو کوئی باپ خوش نہیں ہو سکتا۔ نادیہ " جج صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا

" یہ بات نہیں ہے ڈیڈی! میں جانتی ہوں "

" کیا جانتی ہو تم، کیا بات ہے " وہ اس کی خاطر ہنسے

" میں کہہ نہیں سکتی ڈیڈی، آپ خفا ہوں گے، کہیں گے کہ میں پھر بے تکلفی اور بے ادبی کرنے لگی "

" نہیں کہوں گا، تم کہو کیا کہہ رہی تھیں! " وہ اس کے چہرے پر تھوڑا سا جھجکتے ہوئے مسکرائے۔

" بیٹی کی شادی تو ایک اہم فرض ہے ڈیڈی، جسے پورا کر کے باپ خوش ہوتا ہے رنجیدہ نہیں ہوتا، ڈیڈی میں جانتی ہوں آپ کو وہ پرانی یادیں پریشان کر رہی ہیں!

جو کبھی مرتی نہیں اور کبھی اچانک تازہ ہو جاتی ہیں تو بہت تکلیف پہنچاتی ہیں۔"

"ماہیہ!" حیران اور سراسیمہ سے ہو کر جج صاحب نے کہا "تمہیں یاد ہیں بیٹی وہ باتیں۔ میں تو کبھی کے بھول بھی گیا تھا، تم بھی بھول جاؤ!"

"یادوں کو بھول جانا بڑی بے وفائی ہے ڈیڈی!" ناجیہ بولی۔

جج صاحب سیدھے ہو بیٹھے اور تعجب سے اسے گھورتے ہوتے بولے "اس عمر میں یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی! وفا اور بے وفائی کے اس اظہار نے کہا "مجھے کیا آج کل واہیات رومانی ناول پڑھ رہی ہو"

"نہیں ڈیڈی!" وہ دل کھول کر ہنسی "ایک شعر لکھا دیکھا وہ اچھا بیان کرنے والا ہے۔ ایسا خوب صورت شعر تو میں نے اپنی ساری زندگی میں نہ پڑھا آپ کو سناؤں، یہ وفا اور بے وفا اسی شعر میں جگنوؤں کی طرح جڑے ہیں"

"سناؤ، کیا شعر ہے؟" جج صاحب کی اداسی صرف اسی کراہ جو اس سے چھلکتی تھی، اس کی شریر مگر معصوم باتوں میں دلچسپی بھی بہت رکھتے ہیں۔

"سنیئے ڈیڈی! باجی جان کہہ رہی تھیں کہ دنیا کے بہت بڑے شاعر کا ہے یہ شعر" ناجیہ بولی اور شعر سنایا۔

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا!

کتنا حسین شعر ہے نا ڈیڈی!"

جج صاحب کا چہرہ متغیر ہونے لگا، انھوں نے زیر لب کہا "ہاں، بہت سب ایک دکھے دل کی پکار معلوم ہوتی ہے۔"

اتنے میں ان کا ملازم ٹرالی ڈھکیلتا ہوا آ گیا اور بڑی تپائی صوفے کے پاس

سرکار اس پر تما ناز کھینے لگا۔ پھر بڑے ادب سے بولا

"سرکار، بیگم صاحب نے کہلایا ہے کہ آپ کھانے کے بعد اندر آ کے دلہن کے کپڑے اور زیورات دیکھیے!"

"اچھا۔ ٹھیک ہے کہدینا، آؤں گا"

ناجی ہنس دی "کیا دیکھیں گے، وہ سب چیزیں تو پٹی میں باندھ کے میں جی جان کو دکھانے لے گئی تھی، وہ بھی نہیں، نرسری گئی تھیں کچھ گملے لانے کے لئے۔ وہ آ جائیں اور سب کچھ دیکھ لیں تو واپس لاؤں"

"یہ کیا غضب کیا تم نے بیٹی!" ہکا بکا ہو کر جج صاحب بولے "اور ایک آدھ چیز ادھر سے ادھر ہو جائے تو تم اپنی ماں کے طوفانی غصے کا کس طرح مقابلہ کرو گی مگر سب چیزیں لے کسطرح گئی تھیں، ضروری کیا تھا وہاں لے جانا؟"

"اوہ ڈیڈی!" ہاتھ نچا کر اس نے کہا "کیا انھیں نہ دکھاتی، پھر وہ کیسے سمجھتیں شادی میں شریک ہونے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا کہ ان کا دل کمزور ہے وہ دلہن کی رخصتی کا منظر برداشت نہیں کر سکتیں اور امی کا غصہ کیا، وہ کچھ اہم نہیں رہا۔ بات بات پر غصہ کرتی ہیں، اچھا آپ کھائیے، میں چلتی ہوں، وہ آ گئی ہوں گی۔ دیکھوں بھلا نرسری سے کیسے گملے لائی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ قلانچیں بھرتی زینے سے اترتی چلی گئی، جج صاحب پر تفکر انداز میں نوالے اٹھاتے رہے، مگر سمجھ نہ سکے کہ وہ کیا کھا رہے تھے

پھر وہ ہاتھ دھو کے ملازم سے چائے لانے کیلئے کہہ ہی رہے تھے کہ زنان خانے سے شور و غل کی آوازیں آئیں، انھیں بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اب وہ بلائے عظیم سب کے سامنے بڑی سی گٹھڑی اٹھاتے آئے گی تو کیا عالم ہو گا بیگم کے قہر و غضب کا۔ ملازم

چائے لایا اور ساتھ ہی بیگم صاحب کا لال بھبھوکا ہوا چہرہ آگیا، سسنے رہا تھا
۔ کراہتوں نے کہا۔

غضب ہو گیا، بہن سے کنگ لڑے اور زیوروں کی، نقد تجوری سے
ادھر ہی غائب ہے ہی نہیں، میں کہتی ہوں کوئی آسیب گھس گیا ہے گھر میں، پہلے
بھی زیور دیئے گئے، کپڑے گئے اور اب پھر کسی نے آنکھوں سے کاجل چرایا ہے
اب کیا ہوگا، سب کچھ لاکھوں کا سامان تھا، ہائے میں تو مر جاؤں گی، خدا کے
لئے کچھ کیجئے!"

ان کے غل مچانے کے جواب میں نہایت نرمی سے جج صاحب بولے "کوئی
چیز چوری نہیں ہوئی، سب کچھ ناجیہ لے گئی ہے، ہمسائے میں اپنی دوست کو
دکھانے لائی ہوگی!"

خدا کا قہر ہے" وہ زیادہ بگڑیں "اس بالشت بھر کی پرکالہ نے تو نقب
میں کیسے تیر ڈالے ہیں، آخر لے کیوں گئی، کون ایسی جادوگرنی آ کے بسی ہیں پڑوس
میں پاگل کر کے رکھ دیا ہے کم بخت کو پہلے ہی کچھ کم شیطان نہیں تھی" اتنے میں
ناجیہ ڑ ساتھ سر پر کھڑے آگئی! ساری بیگموں کی آنکھیں اس پر لگ گئیں جب
ا بیگم صاحبہ اس کا کان پکڑے چیخ چلا رہی تھیں۔

ازل کی صبح سے شام ابد تک
محبت داستاں در داستاں ہے

شادی کے دن جج صاحب کی کوٹھی میں بڑا ہنگامہ تھا۔ ناجیہ ویسے تو نو عمر تھی مگر ماحول کی سنجیدگی کی عادی تھی، گھر میں مہمانوں کی وہ کثرت اور خواتین کا ایسا ہجوم تھا کہ ناجیہ کا اس ہجوم میں ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ بارات تو بعد مغرب آنے والی تھی، دوپہر تک شور و غل اور بڑھ گیا۔ رات کی دعوت کیلئے باورچی پچھواڑے صحن میں دیگیں چڑھا چکے تھے اور شاید سویٹ ڈشیں تیار بھی کر دی تھیں بارہ پندرہ جٹے ہوئے تھے، بیڑیاں پی رہے تھے، اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ناجیہ اچانک وہاں جا کھڑی ہوئی اور وہ سب گڑبڑا کر خاموش ہو گئے ایک آدمی نے دست بستہ عرض کی۔

"فرمائیے صاحبزادی!"

"رات کیلئے تم لوگوں نے کھانا تیار کر لیا؟"

"سرکار! صرف میٹھے بنائے ہیں اور دوپہر کیلئے لونگ الائچی میں بگھارے چاول اور بھونا گوشت ہے۔"

"اس اسٹینڈ پر جو بڑا ٹفن باکس رکھا ہے ان چیزوں سے اسے بھر دو!"

"میٹھے بھی سرکار!"

"جو کچھ ہے سب !"

باورچی نے بڑی پھرتی سے ٹفن تیار شدہ چیزوں سے بھر دیا اور حیران سا اسے دیکھتا رہا، آدھا شہر تو اس کوٹھی میں ڈھل آیا ہے، یہ صاحبزادی کہاں جا رہی تھیں رع کھانے کے،

ناجیہ نے ٹفن سنبھالا اور مڑ کر باغ کی راہ سے چل دی، جیسے جیسے باغ کی ٹھنڈی مہکی ہوئی ہواؤں میں بڑھ رہی تھی ویسے ویسے اس کا دل بھی نو شگفتہ کلی کی طرح کھلتا جا رہا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ دلپذیر اور گہری ہوئی جا رہی تھی،

رحمت زہرہ کے گھر میں ہمیشہ کی طرح سناٹا چھایا ہوا تھا، خالہ اماں دالان کے سرے پر بیٹھی اپنی پسند کا پان کھولے تمباکو کھانے میں مصروف تھیں اسے دیکھ کر مسکرائیں اور کچھ حیرت سے بولیں۔

"آج کیسے گھر سے نکل سکیں بیٹی، بٹیا کہہ رہی تھیں آج تمہاری بہن کی شادی ہے، میں نے بھی دیکھا تھا اللہ بنائے رکھے، کوٹھی پچھلی رات ایسی جگمگا رہی تھی جیسے آسمان کے سارے تارے اس کے در و دیوار پر چپک گئے ہوں۔"

"خالہ اماں کوئی شادی کوئی غمی مجھے یہاں آنے سے نہیں روک سکتی،" ناجیہ نے جواب دیا "باجی جان کہاں ہیں؟"

"ان کے سر میں رات سے درد تھا، رات دیر تک پڑھتی رہی تھی، صبح کی نماز کے بعد میں نے کہا کہ ذرا دیر سو رہے، جاؤ دیکھو سو رہی ہے کہ جاگ گئی۔

ناشتہ دان میں پھر کچھ لے آئیں کیا بیٹی؟"

"باجی جان اور آپ کھانا کھا چکیں کیا؟"

نہ کیسے کھا لیتے! صبح سے یہ وقت آیا۔ بیٹا کمرے سے نکلیں ہی نہیں، میں نے بھی کہا کہ اچھا ہے آرام کرلیں۔"

ناجیہ نے ناشتہ دان ان کے پاس رکھ دیا اور دبے قدموں ان کے کمرے میں پہونچی، وہ اپنے صاف شفاف اور پھولوں سے بسے بستر پر دیوار کی طرف کروٹ لئے لیٹی تھیں، ناجیہ نے ان کے کندھے پر سے جھانک کر ان کا چہرہ دیکھا اور ان کی لمبی لمبی پلکوں پر ستارے چمکتے دیکھ کر ان پر اداس ہو گئی۔

"میری باجی! اب کیوں روئیں آپ؟" روہانسی ہو کر وہ بولی، اس کی نظریں ان کے تکیے پر پڑیں جس کے نیچے چند خط نظر آرہے تھے، نہ جانے کس کے خط تھے اور انھیں پڑھ کے وہ کیوں آنسو بہانے پر مجبور ہوئی تھیں، پھر وہ خود بخود سمجھ گئی کہ وہ پرانے خط ان کے بے وفا محبوب ہی کے ہوں گے، اپنی ستم رسیدہ باجی کی دکھی کہانی سن کر ناجیہ نے ان کے سنگدل اور بے وفا محبوب کو برا بھلا ہی کہا تھا، اب بھی زہر بھرے لہجے میں بولی:۔

"کیا حاصل ہوتا ہے باجی! پرانی یادوں کو دہرا کے آپ روتی ہیں اپنا دل دکھاتی ہیں، اور وہ آدمی جو آپ کے آنسوؤں کا سبب بنا ہے نجانے کہاں بیوی بچوں میں آرام سے بیٹھا ہوگا، سچ باجی اگر کبھی خدا کی قدرت سے وہ مجھے کہیں مل جائے تو آپ کی طرف سے میں اسے اتنی باتیں سناؤں کہ اگر غیرت مند ہے تو مر ہی کے رہ جائے۔"

اچانک انھوں نے اس کا منھ بند کر دیا اور بھیگی بھیگی پلکیں جھکا کے مسکرانے لگیں

"یوں نہ کہو: میری ناجو۔ میں نے جب سارے زندوں اور مردوں کو معاف کر دیا تو تم بھی معاف کر دو، اور اب خفا نہ ہو، ہاں تم پر علینہ اپنی بہن کی شادی کے

(ان) کیسے اسکوں، ان کے پاس بیٹھی رہا ہیں، ہم لوگ ایک طویل مدت کے لئے تم سے جدا ہو جائیں گی۔"

"ہو جائیں .. ناجیہ سیدھی ہو بیٹھی اور اپنے آنچل سے ان کی آنکھیں صاف کرنے لگی "جب وہ بھی خوشی خوشی اپنے میاں کے ساتھ جا رہی ہیں اور ان کے دل پر کوئی اثر نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے کہ میں روؤں۔ باجی سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے عورتوں کے فضول نخرے ہی نہیں آتے۔ میں تو ایک تم گرل ٹائپ ہوں، امی سے دریں کہتے ہیں کہ میں لڑکا بنتے بنتے لڑکی بن گئی ہوں۔"

وہ لباس برابر کرتی اٹھ گئے بیٹھ گئی تھیں اور اپنے گھونگھریالے خوشنما بالوں کو سنوارتی ہوئی بولیں "اچھا ہوا تم لڑکا نہ بنیں، ورنہ میری پیاری دوست کیسے ہوتیں۔"

آپ کیا صبح سے کمرے میں لیٹی پرانے خط پڑھ پڑھ کے رو رہی تھیں کمرے سے باہر نہیں نکلیں، خالہ اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ کے سر میں درد ہو رہا تھا، نہ جانے باجی آپ خود ہی اپنی تکلیفوں کو دعوت دے کر کیوں بلاتی ہیں، اب اٹھئے منہ ہاتھ دھوئیے، میں بہت مزیدار کھانے لائی ہوں، سب مل کے کھائیں۔"

"ناجو، تم نے اپنا یہ کیا وطیرہ بنا رکھا ہے" انھوں نے کہا "جب کبھی آتی ہو کچھ نہ کچھ لئے ہوئے آتی ہو، میرا پکایا ہوا کھانا تو سب پھینکنے میں جاتا ہے، مگر جب کھایا کرو ناجیہ، کھانا دانا ساتھ کیوں لاتی ہو، کیا میرے پاس کھانا گوارا نہیں؟"

"اللہ باجی! اس طرح مت سوچئے" ناجیہ ان کا ہاتھ چوم کر بولی "میں تو ساری زندگی آپکے ہاں کھا لوں، مگر ہمارے ہاں جو شادی بیاہ یا دعوتوں کے لئے پکتا ہے آپکے بغیر میں نہیں کھا سکتی اس لئے لے آتی ہوں۔"

خالہ اماں دروازے میں نظر آئیں۔

اب کیا باتوں ہی سے پیٹ بھر جائے گا یا کھانا بھی کھائیں گے ہٹیٔ میرے تو ہاتھ پاؤں میں سنسنی چھوٹی ہے، میں بوڑھی آدمی ہوں، بھوک کی برداشت نہیں رہ گئی ہے مجھے۔"

"آیئے باجی، جلدی کیجئے!" ناجیہ نے انھیں ہاتھ تھام کے کھڑا کر دیا۔ "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

وہ کمرے سے نکلنے لگیں، ناجیہ نے ان کے بستر کی چادر برابر کی، تکیے کے پاس رکھے جوہی کے باسی پھول سمیٹ کے تکیے قرینے سے رکھنے لگی، اسکی نظر ادھ کھلے خط پر پڑی اور وہ ایکدم سے چونک اٹھی۔

سفید کاغذ پر بکھرے ہوئے سیاہ موتی اسے جانے پہچانے سے لگے گناہ کا احساس دل میں لیئے اس نے ایک سطر پڑھنے کی جسارت کی تھی۔

"تمہاری تصویر ملی، چہرے پر جلال وجمال کا دلفریب نظارہ ایسا ہے کہ دیکھنے کے بعد دل پر قابو ——————"

باہر سے خالہ اماں نے آواز دی، خط کو جلدی سے تکیے کے نیچے رکھ کے وہ باہر بھاگ گئی، مگر نجانے کیوں اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب سی ہو رہی تھی اور وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک سا سواد خط بہنوں کا ہوتا ہے لیکن وہ سوچ ضرور رہی تھی کہ اس خط کی تحریر اس کے ڈیڈی کے سواد خط سے بہت ملتی جلتی تھی۔ مگر اس نے اس بے بنیاد یقین کو دماغ کی سطح سے جھٹک دیا اور بے پروا ہو گئی۔

کھانا انھوں نے اپنے پسندیدہ نیم تلے کھایا، دوپہر ہی سے آسمان بھورے

بھورے بادلوں سے چھپنے لگا تھا، کبھی کبھی بجلی کی ایک لہر دکھائی دیتی تھی اور جیسے زمین کی بنیادوں میں بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ گونجنے لگتی تھی۔

"برسات کا موسم مجھے بہت پسند ہے" مدحت زہرہ نے کہا "بارش میں نے سارے درختوں کو نہلا دیتی ہے اس کے بعد باغ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کا دلکش منظر دیکھنے کو دو آنکھیں ناکافی ہوتی ہیں۔"

"آپ کا باغبان بہت سلیقہ مند ہے، کتنی ترتیب سے درخت لگائے ہیں" باجیہ نے کہا "ہمارا مالی تو گنوار ہے، پھل دار اس نے برآمدے کے سامنے لگا دئے ہے اور پھولوں کے پودے دور دور بودئے اور ابھی پھل پھول آنے میں کئی سال باقی ہیں۔"

"کہاں کا باغبان" انھوں نے کہا "تم نے یہاں کوئی باغبان کبھی دیکھا ہے یہ سامنے والا باغ اور پچھواڑے کے سارے درخت میں نے لگائے ہیں۔"

"آپ نے اکیلے ــــ" آنکھیں پھاڑ کر وہ بولی "اور وہ جو نرسری سے دور اوگرا اور ہار سنگھار کے پودے آپ لائی ہیں۔"

"ہاں۔ ابھی وہ نہیں لوئے اپنے کمرے کی کھڑکی کے نیچے بونے کا ارادہ ہے۔" انھوں نے کہا "کل کچھ بخار سا آگیا تھا اور آج سر میں درد ہے کسی کام میں جی نہیں لگتا، اگر تم نہ آتیں تو میں کاہلوں کی طرح پلنگ پر پڑی رہتی۔"

جمیہ نے ان کی بانہہ پکڑ کے بڑی تشویش سے کہا۔

"آپ کا بدن تو اب بھی گرم ہے باجی! آپ نے بخار میں کھانا کیوں کھایا؟ نہیں خدا کرے راستہ بڑھ نہ جائے۔"

انھوں نے ہنس کر کہا "بڑھ جائے تو کیا مجھے تو انتظار ہی رہتا ہے کسی ایسی سنگین

بیماری کا جو یہ خوش خبری سنائے کہ اب یہاں سے جانا ہے۔"

"ہاں ـــ یہی انعام ہے میری محبت کا۔" ناجیہ منہ پھلا کر بولی "خیر ٹھیک ہے آپ کیجیے انتظار خوش خبری کا، میرے لئے بھی وہ خوش خبری ہی ہو گی، آپ کے بعد میں تجا کے بھی کیا کروں گی، آؤں گی آپ کے پیچھے پیچھے۔"

"دور کرو، یہ نگوڑی باتیں"، خالہ اماں نے دخل دیا اور ان سے بولیں "رات بھی تمہیں بخار تھا، کتنا کہا چلو دکھا آئیں۔ مگر میں اب نہ مانوں گی، رات کو ضرور ضرور لے چلوں گی۔ سچ کہتی ہے لڑکی اگر بخار بڑھ گیا تو کیا ہو گا؟"

نہیں بڑھے گا، آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اس وقت خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہی ہوں۔ خفیف سا سر کا درد ہے جاتا رہے گا۔"

"کافی بنا لاتی ہوں" خالہ اماں برتن وغیرہ سمیٹ کے چلی گئیں اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے پتھر پر بازو کو سرہانہ بنا کے لیٹ گئیں۔ ناجیہ ان کا سر دبانے لگی اور لوری دینے کے انداز میں بولی،

"باجی! میں آپ کو نصیحت تو کر نہیں سکتی، مگر ایک درخواست ہے میری، آپ اب پچھلی باتیں بھول جائیے، انہیں اب یاد کرنے سے فائدہ بھی کیا، وہ دن جو حاصل حیات تھے آنے سے رہے، ان کی یاد البتہ دماغ پر بوجھ بن جاتی ہے۔ اب آپ سے میں کیا کہوں، ہمارے ڈیڈی ہیں نا، ان کا حال بھی یہی ہے۔" وہ یکبارگی ہنس دی "اچھے خاصے ہنستے بولتے یکبارگی اس قدر اداس ہو جاتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر رحم آتا ہے۔ ابھی پرسوں تو سوں اداس دلگیر بیٹھے تھے۔ حالانکہ شادی کا گھر تھا ان کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر ان کا حال عجیب تھا، میں نے وجہ پوچھی تھی مجھ سے ہی تو ڈیڈی دل کی باتیں کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ پرانی یادیں ہیں جو اس عمر تو نازد ہو جاتی ہیں تو

دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اب تو سمجھتی ہوں کہ اپنے زمانے میں ڈیڈی بیچارے نے بھی یقیناً کسی سے محبت کی ہوگی جو شاید نبھ نہ سکی ورنہ ان کے سے خوش نصیب آدمی کی اداسی کیا؟"

وہ چپ رہیں، خالہ اماں کافی لے آئی تھیں، اس کے بعد بدحت زہرہ نے ناجیہ سے اصرار کیا کہ وہ اب گھر چلی جائے، کیونکہ اس کی کوٹھی میں برپا ہونے والا شور مدھم مدھم سا یہاں تک پہنچ رہا تھا۔

"آپ کو بخار ہے، آپ کو چھوڑ کے کیسے چلی جاؤں" وہ بولی

"سچ مچ، تم جاؤ بیٹی" خالہ اماں نے کہا "ان کے پاس میں ہوں، مغرب کے بعد ضرور ملنے جاؤں گی، فکر نہ کرو، ہاں تم مطمئن رہو۔"

"اچھا میری اچھی!" وہ ان سے لپٹ کر اور کسی قدر رو کے بولی "آپ کو میری قسم آپ اپنی طبیعت خراب کرنے کیلئے وہ پرانے خط اب نہ پڑھئے گا، وعدہ کیجئے مجھ سے۔"

انھوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی اور بولیں "نہیں پڑھوں گی ناجو! نہیں پڑھوں گی۔"

"میں وہ خط اسمٹ کے جلا دوں؟" ناجیہ نے پوچھا

"نہیں نہیں ایسا ظلم مت کرنا، وہ تو میرے ساتھ میری قبر میں جائیں گے ناجو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب نہ پڑھوں گی، مگر وہی تو میری زندگی ہیں!"

ناجیہ ان کا منھ تکتی رہ گئی۔

ان کے زیادہ اصرار پر وہ گھر لوٹ گئی، لیکن اس کا سارا دل ان ہی میں لگا رہا۔ گھر کی چہل پہل اسے وحشت خیز لگ رہی تھی۔ عجیب طرح کا کچھ

ماحول ہو رہا تھا۔ جیسے شادی نہیں ہو رہی تھی، خواتین میں علق پھاڑنے کا سقا! ہو رہا تھا۔

ناجیہ کی پرواہ کسے تھی، نہ اسے کسی نے پوچھا۔ نہ اس نے کسی کام میں حصہ ہی لیا۔۔۔ اور پھر اس کی کوئی ایسی سہیلی بھی تو نہیں تھی جو زبردستی کر کے اسے محفل میں گھسیٹ لے جاتی۔ جس نے انسانی دیواریں، راسی دراز کر کے دلہن کے کمرے میں جھانکنا چاہا مگر کچھ دیکھ نہ پائی۔

بارات آچکی تھی۔۔۔،

اس نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے سنا،

جج صاحب کی آواز آرہی تھی، وہ اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ عذرا کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"میرے، بے چارے ڈیڈی۔" ناجیہ نے، نئی آنکھیں ملتے ہوئے کہا "شاید بیٹی سے پوچھنے گئے ہیں کہ اُسے یہ عمر بھر کا قید قبول ہے کہ نہیں، ایک باپ پر یہ وقت کتنا کڑا اور دقت ہوتا ہے، اچھا ہوا کہ میں نے ساری عمر یوں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے، ورنہ ڈیڈی کو ایک بار پھر ایسی ہی جانگسل آزمائش سے گزرنا پڑتا۔۔۔"

ناجیہ نے نہ تو لباس تبدیل کیا، نہ بال سنوارے، بس قنوطی بنا اپنے کمرے کی نئی کھڑکی میں بیٹھی پچھواڑے باغ میں بجانے کیا دیکھتی رہی تھی۔ باغ دھندلکوں میں کھویا جا رہا تھا اور وہاں کوئی دلکشی نہ رہ گئی تھی۔

مہمان خواتین نے جو چٹکیں مارتے سمندر میں ناجیہ کی حیثیت ایک قطرے سے بھی کم تھی، کسی کا خبر ہی نے نہیں لی، وہ بھی بے خبر کھوئی سی ہوئی نہ جانے کیا کچھ

سوچ رہی تھی، اس کا بیش قیمت اور خوبصورت لباس بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس پر زیورات کے دو تین کیس بھی رکھے ہوئے تھے زرق برق کے مخملی سینڈل بڑے قرینے کے ساتھ رکھ دئے گئے تھے بالوں میں سجانے کے لئے ایک مہکتا ہوا خوبصورت سا گجرا نیچے پڑا ہوا تھا، مگر ناجیہ تو ان چیزوں میں سے کسی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

اس کے دماغ میں بیک وقت اپنے باپ کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا گونج رہا تھا، اور اس میں گھلی ملی زہرہ کی محبت کی دلگداز مگر ناکام کہانی سسک رہی تھی اور ان سب پر گریہ کناں وہ جانی پہچانی سی تحریر، کس کی تحریر تھی وہ ــــــ،

" تمہارا تصور تمہارے چہرے کا البم زندہ دیکھا ہے۔
کر دل قابو ــــــ"

یہ لکھا تھا اس کے آگے، کاش وہ جلدی سے پڑھ لیتی، اور یہ بھی اندازہ کر لیتی کہ وہ طرز تحریر کس کا تھا وہ زہرہ کے اسمے زہرہ کا خیال آئے جا رہا تھا: معلوم نہیں اب وہ کیسی تھیں، ان کے ایک بوڑھی از کار رفتہ خادمہ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر رات کے کسی حصے میں ان کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو کیا ہوگا؟

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا، شاید کھانا ہو چکا تھا اور دلہن کا جہیز نکالا جا رہا تھا۔

دالان میں آرسی مصحف کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

اس نے پردے کی سلوٹوں کے پیچھے چھپے ہوئے یہ منظر بھی دیکھا، کہ دولہا دلہن

زرنگار سہرے پر آمنے سامنے براجمان تھے، ان پر جھلملاتا ہوا ایک دوپٹہ پڑا تھا، اور ان دونوں کے ارد گرد شور مچاتی ہوئی لڑکیوں اور قہقہے لگاتی ہوئی عورتوں کا ایک ہجوم تھا۔

"... وہ دونوں تو بہر حال ایک دوسرے کو دیکھ ہی لیں گے" برا سا منھ بنا کر اپنی عادت کے مطابق وہ بلند آواز میں بڑبڑائی "بھرے مجمع میں اس تماشے کی کیا ضرورت تھی"

رخصتی کے وقت وہاں آنسوؤں کی برسات شروع ہوئی۔

عذرا کو بیگم سلمیٰ نے اپنے گلے سے لگا رکھا تھا اور سسکیوں سے روئے جا رہی تھیں پھر وہاں جج صاحب بھی آئے، ان کا چہرہ نہ جانے کن کن جذبوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ ان پر نظر پڑتے ہی ناجیہ کے آنسو بہنے لگے انھوں نے بھی پھولوں سے لدی ہوئی اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ان کے سر پر بوسہ دیا تھا، دولہا بھی ان کے پاس ہی کھڑا تھا، نہ جانے کس نے جج صاحب کو کیا کہ انھوں نے عفان اور عذرا کے ہاتھ پکڑ کے ملا دئیے، پھر وہ دونوں اپنی زندگی کی نئی شاہراہ پر آگے بڑھ گئے، ایک ہجوم پیچھے چلا، ناجیہ نے دھندلی آنکھوں سے انھیں جاتے دیکھا اور زیر لب بولی

"باجی خدا حافظ!"

اور پردے کی سلوٹوں میں منھ چھپا کے رونے لگی۔

یہ میری زندگی کا ماحصل ہے
نہ بکھیرے اس داستاں کو دنیا ہے

بیگم سلمیٰ کی ملنے والی خواتین میں کئی ایک بڑے خوش حال اور اونچے گھرانوں سے متعلق تھیں۔ ان میں ایک مزافتدار حسین بھی تھیں، جو بیگم سلمیٰ کی کی بہت گہری دوست تھیں، عذرا کی شادی پر وہ سب سے پہلے آئی تھیں اور ناجیہ کو خوب اچھی طرح سے دیکھ کے دل ہی دل میں ان کے لیے کچھ سوچ لیا تھا، مگر شادی کی گڑبڑ میں کچھ کہا سنا نہیں، شادی کے بعد بھی دولہا دلہن کے گھروں میں رسموں اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا تھا۔
خدا خدا کرکے ایک ہفتہ بعد جب جج صاحب کے گھر میں سکون ہوا اور سارے روزمرہ کے کام از سرِ نو شروع ہو گئے اور عذرا چند دن کے لیے عفان کے ساتھ بنگلور ان کے کسی دوست سے ملنے چلے گئے، تب ایک رات ڈنر کے بعد مسز اقتدار نے جج صاحب سے کہا
"مصطفےٰ بھائی! ایک بڑی ضروری بات آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مان لینے کا وعدہ کریں تو زبان پر لاؤں، ورنہ اپنا منہ خالی کرنے سے کیا فائدہ ہے؟"

"ضرور کہیئے !،، جج صاحب نے کہا " میرے امکان میں جو بھی ہوگا وہ میں یقیناً کروں گا۔"

"آپ وعدہ کرتے ہیں ؟"

"آپ کی بات سننے کے بعد۔،، جج صاحب نے کہا " ورنہ اگر وعدہ وفا نہ کرسکوں آپ کو صدمہ ہوگا اور شرمندگی مجھے ہوگی ۔"

"آپ کو تو معلوم ہے کہ خدا نے مجھے صرف تین بیٹے ہی دئے ہیں ، ایک بیٹی کی مجھے بڑی تمنا ہے ، آپ سے التجا ہے کہ آپ اپنی بیٹی مجھے دیدیجیئے ۔"

"جی !،، کھانے سے ہاتھ روک کے حیرت سے جج صاحب بولے ،

" وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے ۔" انھوں نے پھر کہا ، " تین چار دن سے برابر بچھ رہی ہوں اور جی ہی جی میں اس کی بلائیں لے رہی ہوں ، دعا مانگ رہی ہوں کہ اسے پروردگار میرے گھر کا اجالا بنا دے ۔"

" محترمہ بیگم صاحبہ ! جج صاحب نے کہا " آپ نے جو کہا ہے وہ شاید میں ابھی تک ابھی سمجھ نہیں سکا ۔"

"انھوں نے مجھ سے پہلے بھی ایک بار ناجیہ کے لئے کہا تھا ۔" بیگم سلمیٰ نے جج صاحب سے کہا " میں نے جواب دیا تھا کہ مجھ سے نہیں ، جج صاحب سے کہیئے !،،

" اچھا اچھا ،، جج صاحب نے کبیدہ خاطر ہوکر مگر بظاہر خوش طبعی سے بولے " بس سمجھ گیا ۔ آپ اپنے کسی صاحبزادے کیلئے ــــ ۔

"ہاں مصطفیٰ بھائی !،، وہ جیسے گھگھیائی تھیں " میرے سب سے بڑے لڑکے حارث نے بزنس کورس کرلیا ہے اور سیٹھ نورانی کے ساتھ کاروبار کررہا ہے ، آپ کا جی چاہے تو اس سلسلے میں تحقیق کر لیجیئے کہ خدا کے فضل سے وہ

ترقی کر رہا ہے، اس کی عمر اب اللہ رکھے چھبیس سال ہے بات یہ ہے مصطفیٰ بھائی کہ اقتدار حسین صاحب سروس کے سلسلہ میں اکثر باہر چلے جاتے ہیں، لڑکے بھی گھر میں نہیں رہتے، حارث تو خیر بہت مصروف رہتے ہیں، دونوں چھوٹے کالج جاتے ہیں۔ میں گھر میں بالکل تنہا ہوتی ہوں، اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے گھر میں ایک چاند سی بہو لے آؤں، سچ مانئے کہ میں آپ کی بیٹی کو بہو بنا کے نہیں بیٹی بنا کے لے جاؤں گی۔"

"میں جانتی ہوں کہ نسرین بہن بہت اچھے مزاج کی ہیں، ہم دونوں تقریباً بیس برس سے ایک ساتھ ہیں" بیگم سلمیٰ ان کی سفارش میں بولیں "ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی ہے، ان کے بچے میرے سامنے بڑے ہوئے ہیں اور حارث تو بہت نیک اور ہونہار اور نہایت شریف بچہ ہے، مجھے بھی بہت پسند ہے، آپ نے بھی اسے دیکھا ہوگا، مگر شاید یاد نہیں ہوگا۔"

اور جج صاحب بولے "عرض یہ ہے جناب کہ لڑکی کی شادی تو کرنی ہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شادی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، ناجیہ کا اٹھارہواں سال ہے اور میرے خیال میں یہ عمر اسے شادی بیاہ کی ذمہ داریوں اور بال بچوں کی مصیبت میں مبتلا کرنے کی نہیں ہے۔

آپ نہیں جانتیں وہ بہت شریر، کھلنڈری، چنچل اور ناسمجھ ہے شادی کی اہمیت اور شوہر کے مرتبے کو سمجھنے کا شعور ابھی اس میں نہیں آیا ہے، کیا فائدہ ہے کہ میں حامی بھر دوں، اور آپ اسے بہو بنا کے یا بیٹی سمجھ کے اسے لے جائیں اور بعد کو آپس میں شکایتوں کے در کھل جائیں، لہٰذا میری گذارش ہے کہ براہ کرم کم سے کم دو تین سال تک اسے مہلت دیجئے ——— اور ——— میں اس سلسلے میں آپ سے

غور کرنے کا وعدہ نہیں ضرور کرتا ہوں۔"

"آپ شاید نہیں جانتے بھائی! کہ میں بہت دنوں سے سانسوں کی بیمار ہوں"
بیگم افتخار نے بڑی حسرت سے کہا "ابھی خاصی بیٹھی ہوں کہ یکبارگی لیا دورہ پڑتا ہے
کہ سانس جاتے جاتے واپس آئی ہے، اس لئے میری آرزو ہے کہ میں کم از کم ایک بچے کا
سہرا تو دیکھ لیتی، زندگی کا اعتبار ہی کیا ہے۔ پھر تانس نے دیکھا ہے اگر آپ میری
ایک یہ تمنا پوری کر دیتے تو یہ آخری سانسوں آپ کو دعائیں دیتی۔ مگر آپ کی
مرضی ہیں تو نہ سہی کوئی اور گھر دیکھوں گی۔ ویسے مجھے آپ کی بچی جیسی بچی کہیں بھی
ملے گی نہیں ___"

"آپ نے علاج اپنا نہیں کرایا؟" جج صاحب نے موضوع بدل دیا۔ دوسرا تذکرہ
چھڑ جائے

بیگم افتخار نے آہ بھر کر کہا "بیچاسوں علاج کرا چکی ہوں میرے بھائی! مگر
کسی سے بھی فائدہ نہیں ہوا ہے، اب تو میں فارغ ہو چکی ہوں کہ میری موت کا بھی
روگ بہانہ بنے گا۔

ایک دورہ پڑے گا اور چلی جاؤں گی دنیا سے۔"

"آپ اتنی مایوس اور ناامید نہ ہوں۔ ہر مرض کا علاج اس کائنات میں موجود
ہے۔" جج صاحب نے کہا اور لاتعلق سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اجازت دیجئے
ضروری کام سے جارہا تھا۔" اور وہ اپنی بیوی کا کھنچا ہوا چہرہ دیکھے بغیر ہی
کمرے سے نکل کر چلے گئے۔

"میں تم سے کہہ رہی تھی ثروت کہ ابھی بیٹی کی بات چھیڑو۔" بیگم شکیلہ بولیں
"بھلا وہ اس رخ پر آئیں گے بھی عذرا کی شادی کرنا ہے کہ میں سالی کی

تھیں اور ان کا بڑا لڑکا حارث واقعی بڑا معقول اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ اور انھیں پسند بھی تھا لیکن انھیں یہ یقین نہیں تھا کہ جج صاحب اس رشتے پر راضی ہو کے منگنی کرنے پر بھی تیار ہو جائیں گے، ناممکن سی بات تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں ہی غلطاں و پیچاں اور اس مسئلے کی اصل جز ناجیہ کو بھول ہی چکی تھیں، وہ تو کسی طرح موم کی ناک نہ تھی، لوہے کا چنا تھی، یا وہ سر پھری کر ان کا کہا کر دیتی، اسے بھی منانا اور سمجھانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، ناجیہ عذرا کی سی سلجھی ہوئی نہ تھی، بہر حال وہ سوچتی رہیں کہ اگر ایسا ہو جائے تو بُرا کیا ہے ——،

دو دن صبر کر کے انھوں نے جج صاحب کا مزاج بحال دیکھ کر دبی زبان سے پھر ذکر چھیڑا اور اس یقین کے ساتھ کہ یہ بات پایۂ تکمیل کو پہونچنے والی قطعی نہ تھی، وہ بولیں۔

"ثروت کہہ رہی تھیں، آپ ان کے لڑکے کو بلا کے دیکھ تو لیجیے!"

"مجھے لڑکا لڑکی دیکھنا نہیں ہے" بیچارگی جج صاحب برافروختہ ہو گئے۔ "معلوم نہیں کہاں کہاں کی عورتیں آ کے تمہیں بہکا کے چلی جاتی ہیں اور تم میرے سر ہو جاتی ہو، ابھی ایک لڑکی کی شادی ہوئے دیر نہیں ہوئی کہ تم کو دوسرے کی فکر لگ گئی، میں پوچھتا ہوں کون سی عمر ہو گئی ہے ابھی اس کی۔ وہ تمہارے سینے کا بوجھ کیوں بن گئی ہے کہ اس بوجھ کو اتار نے کی فکر ہے —— ارے میں اسے ہوسٹل میں داخل کر دوں گا، نہ وہ تمہارے سامنے رہے گی اور نہ تمہاری آنکھوں میں کھٹکے گی، تعجب ہوتا ہے مجھے، پڑھی لکھی ہو تم اور دوسروں کو تم پڑھاتی بھی ہو، مگر عجیب دماغ پایا ہے، جاہل اور گنوار عورتوں کی طرح

بلا جواز رلا دو ـــــ"

"آخر کہیں نہ کہیں تو ناجیہ کی شادی ہو گی، ہم اس کی منگنی کر دیں ایک اچھا لڑکا اور شریف گھرانا ہاتھ سے نہ نکل جائے، شادی دو تین سال بعد کریں۔ آخر عذرا کی بھی منگنی تو لگی رہی تھی تین سال تک ـــــ" بیگم نے اپنی لن ترانی اسی طرح جاری رکھی

"بس اس کے آگے میں سوچنا نہیں چاہتا بس ـــ" جج صاحب بولے "تم کہو تو یہاں بیٹھوں، کہو تو یہاں سے چلا جاؤں؟"

"بیٹھئے آپ!" سخت غصہ پی کے بیگم نے کہا "آپ کی مرضی نہیں ہے تو میں یہ ذکر پھر نہیں کروں گی۔"

"اور اپنی سہیلی کو بھی منع کر دو، آئندہ میرا بھیجہ کھانے یہاں نہ آئے خبردار۔"

"جب میں انکار کہلوا دوں گی تو وہ کیوں آئیں گی؟"

جج صاحب آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے اور اخبار نیویارک ٹائم چہرے کے آگے پھیلا لیا۔ بیگم صاحبہ دو تین منٹ تک اپنی مایوس ترحم آمیز نظروں سے اپنے ضدی شوہر کو دیکھتی رہیں، جو کوئی معقول بات مانتے ہی نہ تھے۔ پھر اندر کے کمروں کی طرف مڑ گئیں ـــ،

عذرا کا کمرہ از سر نو درست کرنا تھا۔ شاید وہ ایک آدھ روز کے لئے یہاں آ کر قیام کرتی۔

دفعتاً ناجیہ نے اپنے کمرے سے آواز دی

"امی! ذرا میری ایک بات سنئے گا!"

"کہو! سن رہی ہوں" وہ بے پروائی کے ساتھ بولیں "ناجیہ کی خود سری،

زبان درازی اور من مانی حرکتوں سے وہ کبھی خوش نہ رہی تھیں اور جب سے ان کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی ہمسائی دوست کی سوء مزاجی کی وجہ سے عذرا کی شادی میں شریک نہ ہوئی تھی اسے رخصت کرنے تک نہ آئی تھی ان کا ملال اور غصہ کچھ زیادہ ہی تھا،

ناجیہ انھیں گھور رہی تھی، بولی :۔

"مجھے معلوم ہو گیا ہے باسط کی بہن سے کہ آپ کی سہیلی نے مجھ پر دانت رکھے ہیں، گھنٹہ بھر ڈیڈی کو بور کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے، بے جان سی گڑیا سمجھتی ہے مجھے، معاملہ متعلق ہے مجھ سے، اور بحث کرتی ہے آپ سے، اگر اس وقت میں ہوتی سامنے تو ایسے جواب دیتی کہ دانت کھٹے ہو جاتے، بیٹی بنا کے لے جائینگی مجھے، نصیب نہیں ہے کوئی بیٹی تو یتیم خانے سے اٹھا لائے، بیٹی بنا لے۔ ایک میں ہی نظر آتی ہوں، مجھے لے جائے گی اور میں سر جھکائے چلی بھی جاؤنگی ایسی فلاقند کی لگدی نہیں ہوں میں کہ سب کسی کا بھی جی چاہے زبان پر رکھے اور اور نگل جائے۔"

"بہت زیادہ بڑھ چلی ہو ناجیہ ؟" بیگم نے غصہ سے لرزتے ہوئے کہا۔ نہ تو تمہارا دماغ ہی قابو میں ہے اور نہ زبان، اور نہ تم کو یہ سوچنے کی تمیز ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو اور کیا کہہ رہی ہو۔ کیا مجھے اپنی کوئی برابر والی سمجھا ہے کہ بکے جا رہی ہو، اور کیا بک رہی ہو اس کی بھی شرم نہیں ہے تمہیں!"

جج صاحب جو اخبار دیکھنے میں کھوئے ہوئے تھے، ماں بیٹی کی بلند آوازوں اور برہم لہجوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ناجیہ کہہ رہی تھی ــــــ :

اور اب میں نے وہ باتیں بھی سُن لیں جو آپ اس قبقرن کی سفارش میں بڑی سے کر رہی تھیں، گھرانا شریف ہے، لڑکا فرشتہ ہے۔
امی: آپ سن لیجئے کہ میں نے عہد کر رکھا ہے، مجھے شادی وادی کر کے کسی کے گھر نہیں جانا ہے، میں زندگی بھر یوں ہی کنواری رہوں گی، آپ لوگ اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے تو میں کہیں دوسری جگہ چلی جاؤں گی۔ اور اگر آپ نے مجھے کسی بات پر مجبور کریں گے تو میں اپنے باپ کی عزیز جان کی قسم کھاتی ہوں کہ پچھواڑے کنوئیں میں گر کے مر جاؤں گی۔ اگر آپ کو اپنے شوہر کی جان کی قسم عزیز ہو تو براہ کرم پھر کبھی اس قسم کا ہمل تذکرہ مت کیجئے گا ورنہ میں یہ کہے دیتی ہوں کہ کنوئیں سے میری لاش نکالنے کیلئے تیار رہئے گا۔"
"ناجیہ!"، حیرت کی زیادتی سے ان کی آواز ان کے گلے میں پھنس گئی۔
ناجیہ نے ایک خونخوار نظر ان پر ڈالی اور کمرے کے دروازے کا پردہ برابر کر کے کمرے میں غائب ہو گئی۔
جج صاحب نے ناجیہ کی باتیں سُنی اور ایک سنسنی سی ان کے جسم میں تیر گئی۔
وہ ادھر دیکھنے لگے جدھر سے اس کی زہریلی آواز آئی تھی اور گم صم سے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے تھے، وہ ناجیہ کو شوخ و شریر اور ضدی اور خود سر تو سمجھتے ہی تھے لیکن یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنے مزاج کی ایسی پتھر تھی جو ٹوٹ سکتا ہے مگر مڑ نہیں سکتا تھا اس نے تو ان کی جان عزیز کی قسم کھالی تھی اور ان کی جان اسے بہت پیاری تھی، کیا ہو گا اگر پھر اسی ذکر پر وہ مارے غصے کے کنوئیں میں پھاند پڑے گی۔
بیگم سلمٰی سر سے پاؤں تک بدحواس بنی ہوئی جج صاحب کے پاس آگئیں اور

ان کے پاس پڑی ہوئی نماز کی چوکی پر بیٹھ کے بیچاری رونے لگیں۔
جج صاحب جن کے ہوش خود بھی کچھ ماؤف تھے، بے خبری میں بولے۔
"کیا ہوا؟"

ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور منھ سے بات نکلنی دشوار تھی، مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح ناجیہ کی دھمکی سے بھری ہوئی ساری باتیں انھیں سنا ہی دیں، پھر ان کے زانو پر ہاتھ رکھ کے گڑگڑائیں۔

"گھوا ہیر سے کہئے کہ وہ کسی طرح وہ کنواں پاٹ دے، جتنا بھی خرچ پڑے گا ہم دے دیں گے، خدا کی قسم جب تک اس کنویں کا منھ کھلا رہے گا مجھے نیند ہی نہیں آئے گی، ہائے آپ ہی بتائیے، کیا کروں میں اس دیدہ دلیر لڑکی کا، کیسے اسے سمجھاؤں اسے، یہ اتنی نڈر اور بے باک کیوں ہو گئی ہے؟"

جج صاحب گھٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

"کہہ دوں گا میں اہیر سے، وہ پاٹ دے گا کنواں، مگر سارے شہر میں کیا وہ صرف ایک ہی کنواں ہے" پھر وہ خود کلامی کے انداز میں کہنے لگے "کیا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی بھر میں، میں اپنی اولاد سے ڈر گیا ہوں، بس میرا خدا ہی مجھ پر رحم فرمائے۔"

بلبلا کے اور کسی خوف کے مارے سہم کے بیگم نے کہا:۔

"میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، خدا کا واسطہ، اب ناجیہ سے کبھی ایسا ویسا ذکر نہ کیجیے گا۔ اُسے کوئی سنک نہ سوار ہو جائے۔"

"کمال کرتی ہو تم بھی ــــ" استہزائیہ لہجے میں جج صاحب نے کہا! "ایسا ویسا بس تم ہی چھیڑتی ہو، میں چھیڑنا تو ایک طرف رہ گیا، ایسا ویسا سُننا بھی گوارہ

نہیں کرتا ہوں بیگم ! "

" اب جاؤں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے مناؤں کہ اپنے ماں باپ کی جان پر رحم کرے " بیگم اُٹھتی ہوئی بولیں " اللہ ! کتنی نڈر، دلیر اور بے باک لڑکی ہے میری عذرا ایسی نہیں تھی ، پڑھ لکھ گئی مگر بے زبان ، منہ مری ، اللہ میاں کی گائے ، جہاں چاہا ہانک دو ہاتھ تھام کے ....."

" اُسے ڈانٹنا ڈپٹنا نہیں بھئی ! " جج صاحب نے بات کاٹ دی " خدانخواستہ کوئی ایسی حرکت نہ کر گذرے کہ پھر ہم سے رہتے نہ بنے ، کیا کر رہی ہے ؟ "

" معلوم نہیں ، اپنے کمرے میں تھی ۔ "

بیگم چلی گئیں ،

• ناجیہ کے پاس جاتے ہوئے وہ جھجک رہی تھیں اور اسے سمجھانے کیلئے الفاظ بھی اپنے ذہن میں ترتیب دے رہی تھیں ، کمرے میں پہونچیں تو وہ موجود نہ تھی اور برآمدے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ باغ کے راستہ ہمسائے میں جا چکی تھی ، خون کھول کے رہ گیا اس کے حق میں دعائیں کرتی باہر آئیں اور نیم جان سی دیوان پر گر کے آنکھیں بند کر لیں ۔

ناجیہ ہمسائے میں پہونچی تو خالہ اماں کو بہت پریشان دیکھا ، ان کے وسیع اور عریض چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ، اور پان زدہ ان کے دبیز ہونٹ تھے کہ خشک ہو گئے تھے ۔

" کیا ہوا خالہ اماں ! " ناجیہ کے اوسان بھی خطا ہونے لگے تھے " کیسی ہیں باجی ؟ آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں ۔ "

" بیٹی میرے دل میں کبوتر اڑ رہے ہیں " وہ بولیں " صبح کو ان کا بخار کچھ کم تھا مگر اب تو بدن ہنسی بنا ہوا ہے ، کیا کروں اس وقت تو کوئی ڈاکٹر بھی نہ ملے گا

اور رات میں ابھی دیر ہے۔"

ناجیہ بھاگتی ہوئی مدحت زہرہ کے کمرے میں پہنچی، وہ اداس بستر پر پائنتی لیٹی ہوئی تھیں، آہٹ سن کر آنکھیں کھول دیں اور مدھم سی تھکی تھکی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔

"آؤ ناجو آؤ" ان کی آواز بخار کی زیادتی سے بھرّا گئی تھی "دیر سے تمہارا انتظار تھا مجھے، تم آؤ گی اور میرے سینے سے لگ جاؤ گی تو میری تکلیف کم ہو جائے گی۔"

وہ ایک سہمی سی بچی کی طرح ان کے سینے سے لگ گئی اور اسے محسوس ہوا کہ وہ جل رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی باہوں میں جکڑ کر اس کی پیشانی پر اپنے لرزتے ہوئے ہونٹ رکھ دئیے۔

"باجی! کیا ہوا، آپ تو صبح تک اچھی تھیں"، ناجیہ گھبرا رہی تھی "یہ اتنا تیز بخار آپ کو کیسے آگیا، باجی! کیا ہو رہا ہے آپ کو، آپ کراہ کیوں رہی ہیں؟"

اس کے اطراف ان کی باہوں کی گرفت کمزور ہو گئی اور وہ عجیب سے گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"معلوم نہیں کیا ہو رہا ہے، جو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سارا جسم ٹوٹ رہا ہے اور ایسا لگتا ہے میں پھر کئی برس پہلے کے پاس بیٹھی ہوں، تم ٹھنڈا پانی لاؤ اور انڈیل دو مجھ پر، شاید یہ ختم ہو جائے۔" وہ پھر تکیے پر گر گئیں۔

ناجیہ نے پریشان ہو کر خادمہ سے کہا:

"آپ ٹھنڈا پانی لے آئیے، کپڑا تر کر کے ان کی پیشانی پر رکھنے میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں موسم بدل رہا ہے، رات تک بخار کم ہو جائے گا۔"

"خالہ اماں!" ناجیہ سرد پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کے ان کی پیشانی پر رکھتے رہے وہ غافل پڑی لمبی لمبی سانسیں لیتی رہیں۔ ناجیہ نے زہرہ باجی کو تسلی دی تھی خود اس کا دل ہول رہا تھا۔ نو سمجھی سے ڈر رہا تھا۔

یکایک آسمان کالے کالے بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ ان میں ابر اور بجلی چمک رہی تھیں، اور خوفناک طریقے سے گرج رہے تھے، ہوائیں جیسے دیوانی ہو کر زمین سے لپٹ رہی تھیں، انہیں جھنجھوڑ رہی تھیں سہ پہر کے چار بجے ابھی خاصی شام لگ رہی تھی۔

خدا کرے کہ جلدی سے صاف مطلع ہو تو بابا کو لے جائیں ڈاکٹر شرما کے پاس میری ان سے پہچان ہے بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔" ناجیہ بولی، اب وہ ان کا سر دبا رہی تھی اور خالہ اماں ہتھیلیاں سہلا رہی تھیں،

"میری جانِ دل،" وہ بولیں "اللہ کے فضل سے یہ بیمار بہت پڑتی ہیں اور اگر پڑتی ہیں تو گلی بھی کسر نکال لیتی ہیں۔ اب بھی ان کا بدن پھنک رہا ہے، کب اترے گا یہ بخار، میرے دل میں پنکھے لگے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، آخر کیسے بلاؤں، کیا کروں؟"

انھوں نے مدت زہرہ کی طرف دیکھا وہ بخار کی غفلت میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں چہرہ سرخ تھا، آنکھوں میں لال لال ڈورے تیر رہے تھے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے۔

"بیٹی کیسا جی ہے؟" بڑی بی روئے دے رہی تھیں

"باجی! کیا سر میں بہت درد ہے؟" ناجیہ الگ روہانسی ہو رہی تھی،
"ناجو!" وہ بھرائی آواز میں بولیں "ابھی کون آیا تھا یہاں کس کے قدموں کی

آہٹیں سنی تھیں میں نے، جانی پہچانی سی آہٹیں تھیں، کون آیا تھا ناجیہ؟" اور وہ چپ ہو گئیں۔

"خدا اُن کے حال پر رحم کرے"، بڑی بی نے آہیں بھرتے ہوئے کہا "کل رات میں نے دیکھا تھا کہ دو ڈھائی بجے تھے، یہ نیم تلے تخت پر بیٹھی تھیں، ٹھنڈک شروع ہو چکی ہے ساری رات۔ بادل تلے کھڑے تھے، سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ سما گئی ہیں ان کے بدن میں، سردی کا بخار ہے، معلوم ہے مجھے، دیر میں یہ بخار اترتا ہے ——"

"شام ہو رہی ہے"، ناجیہ سراسیمہ ہو کر بولی "اور میرا جی گھبرا رہا ہے، باجی کا بخار بہت تیز ہو گیا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں ڈیڈی کو خبر کر دوں، وہ آئیں گے اور انھیں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔"

"میری اجازت کیا بیٹی!"، انھوں نے گھبرا کر کہا "میں خود یہی سوچ رہی ہوں کہ کسی کو بلائیں مشورے کیلئے، مگر کسے بلائیں، اچھی ہونے کے بعد کہیں ناراض نہ ہو جائیں کہ کسی غیر مرد کو مدد کیلئے کیوں بلایا تھا۔"

"ناراض ہوں گی تو برداشت کر لیں گے خالہ اماں"، ناجیہ نے کہا "وہ اس ماحول سے پریشان ہو رہی تھی باہر ہوا چنگھاڑ رہی تھی، سر شام کے دھندلکوں میں رہ رہ کے بجلی کی آتشیں تلوار کی صورت چمک جاتی تھی اس کے بعد ڈراؤنی آواز میں بادل گرجتے۔ ایسے بھیانک موسم میں ناجیہ کسی بیمار کے پاس کبھی نہیں رہی تھی، لاکھ وہ تیز طرار تھی مگر نا سمجھ لڑکی تھی، گھبرا رہی تھی۔ بہت زہرہ کا ہذیان اسے بدحواس کئے دیتا تھا، شاید انھیں سرسام کی سی کوئی کیفیت ہذیان سرائی تک پہنچا رہی تھی۔

ایک دفعہ بجلی اتنے زور سے چمکی کہ سارا دالان روشن ہو گیا اور پل بھر بعد بادل

اس طرح گرجے کہ ناجیہ چیخ مار کر بستر پر اوندھی گئی اور پھر تیزی سے کھڑی ہو کر بولی
"خالہ اماں سوچنے اور دیر کرنے کا وقت نہیں ہے، مجھے تو یا جی بے ہوش معلوم ہوتی
ہیں، میں جا کے ڈیڈی سے کہتی ہوں، وہ کچھ کریں گے، انھیں اس طرح ڈالے رکھنا
خطرناک ہے ڈیڈی کی پہچان کے بڑے بڑے ڈاکٹر اُن سے ملنے آتے ہیں وہ
کسی کو لے آئیں گے، میں جاؤں؟"
"ہاں بیٹی جاؤ! اب تو میں بھی گھبرا رہی ہوں، اللہ ان کی جان کی سلامتی دے
تم اپنے ابا کو لے کر جلدی آجانا" بڑی بی بولیں۔
"بس میں ابھی آئی، خدا کرے ڈیڈی گھر پر موجود ہوں، کہیں چلے نہ گئے ہوں"
ناجیہ بولی اور کسی موہوم سی امید پر حضرت زہرہ پر جھک کر ایک بار اور آواز دی، مگر انھوں
نے آنکھیں نہ کھولیں۔ ناجیہ کمرے سے نکلی اور تیر کی طرح دوڑتی ہوئی زینے پر چڑھ کر
باہر کے دیوان خانے میں پہنچ گئی۔
جج صاحب اپنے خاص دیوان پر نیم دراز تھے اور سرہانے ٹیبل لیمپ آن کیے
کچھ پڑھ رہے تھے، ناجیہ کو بگولے کی طرح آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور حیرت
سے اسے دیکھنے لگے۔
"کیا ہوا ناجیہ! تم رو کیوں رہی ہو؟" انھوں نے پوچھا۔
اس کے آنسوؤں کی روانی تیز ہو گئی "ڈیڈی، وہ بہت بیمار ہیں، بے ہوش ہیں
کیا حشر ہو گا ان کا، ڈیڈی نہ دوا ہے نہ علاج ہے، میں آپ کو لینے آئی ہوں، آپ
چل کے انھیں دیکھیے اور کسی ڈاکٹر کو بلائیے ڈیڈی، اگر انھیں کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ
نہ رہ سکوں گی۔"
"اس قدر نہ گھبراؤ بیٹی! تم ذرا سی بات میں پریشان ہو جاتی ہو، مگر میں چل کے

لیا۔ بجھوں وہ تو پردہ کرتی ہوں گی۔" جج صاحب بولے،

"اب اس کا خیال نہ کیجئے ڈیڈی، ان کی زندگی سے پردہ زیادہ اہم نہیں ہے آپ چلئے ڈیڈی!" ناجیہ نے کہا۔

"اچھا ٹھہرو میں سکینہ کو فون کئے دیتا ہوں، وہ یہاں آجائیں تو تم انھیں کے ہمراہ چلی آنا، تب تک چلو انھیں دیکھ لیں۔"

"چلئے!" ناجیہ بولی۔

"موسم کتنا خراب ہے" جج صاحب نے کہا

"ڈر لگتا ہے نا ایسے موسم سے، کیوں ڈیڈی؟"

جج صاحب نے طویل سانس لی اور خاموش رہے۔ ناجیہ بھی چپ ہو گئی، دونوں جلد ہی پہنچ گئے کمرے کے سامنے خالہ اماں کھڑی تھیں، ان کو دیکھتے ہی جج صاحب اسطرح چونکے جیسے سانپ لگ گیا ہو، ناجیہ کمرے میں ہو رہی،

"میری نظر مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہے، بڑی بی بولیں" مصطفےٰ میاں کیا یہ تم ہو، آگے آؤ کہ میں تم کو اچھی طرح دیکھ سکوں۔"

"خالہ اماں!" جج صاحب بولے "یہی کیفیت میری بھی ہے، بتائیے کیا لیا مدحت بیمار ہیں؟"

"ہاں میاں! وہی تو ——" اور بڑی بی رو پڑیں،

"میں دیکھ سکتا ہوں انھیں؟" جج صاحب کا چہرہ بے رنگ ہو رہا تھا۔

"تم سے کوئی پردہ ہے بیٹا؟" بڑی بی کرتھام کے بیٹھ گئیں، جج صاحب کمرے میں چلے گئے اور ان کے دل کی دھڑکن، ان کے سینے کی وسعتوں میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ "مدحت؟" انھوں نے زیر لب کہا۔

"دیکھا ڈیڈی! یہ بیہوش ہیں نا؟"، ناجیہ نے پوچھا،

"جاؤ جلدی سے گھر جاؤ، ڈاکٹر آ گئے ہوں تو انھیں فوراً لے آؤ"، جج صاحب نے کہا، وہ خود بھی پریشان تھی، کچھ کہے بغیر بھاگتی چلی گئی، جج صاحب آہستہ سے مدحت کے پہلو میں بیٹھ گئے، اور ان کا تپتا چہرہ اپنی طرف کر کے مدھم لہجے میں پکارا "مدحت! ہوش میں آؤ، میں آ گیا ہوں، میری مدحت خفا ہو مجھ سے، بولو گی نہیں، خداوند کریم! میری جنت میرے پاس ہے اسے بخش دے مجھے، میرے حواس درست رکھنا، میرا دل بہت دھڑک رہا ہے"، جج صاحب کی آنکھوں سے آنسو اس طرح بہہ رہے تھے جیسے آنکھوں کے نیچے موجزن دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو،

دفعتاً مدحت نے آنکھیں کھول دیں اور اس طرح جج صاحب کو دیکھنے لگیں جیسے ان کے وجود کو اپنے بیمار ذہن کا کرشمہ سمجھ رہی ہوں۔

"مدحت!"، جج صاحب نے ان کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا "ہوش میں آؤ، دیکھو مجھے، میں تمہارے پاس ہوں، میری زندگی!"

"یہ خواب مجھے جینے نہ دیں گے"، وہ مدہوشی میں سسکنے لگیں "وہی صورت جو سوتے جاگتے دکھائی دیتی ہے وہی آواز جو ہر لمحہ گونجتی ہے، مگر وہ خود کہاں ہیں، کہاں ملیں گے مجھے، میں خواب ہی دیکھتی رہ گئی ـــ" انکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"مدحت! یہ خواب نہیں"، جج صاحب نے آہستہ سے انکو جھنجھوڑا، "آج برانے خوابوں کی تعبیر ملی ہے، میں تمہاری بیماری کا ممنون ہوں، اسی بہانے خدا نے ملا دیا ہے، اٹھ کے بیٹھو، کیا ہوا ہے تمہیں، تم تو ٹھیک ہو۔"

"آپ، سچ مچ"، وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ بیٹھیں، جج صاحب کا مہربان چہرہ ان کے سامنے تھا، وہ ٹکٹکی لگائے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"میرے ہاتھ میں چٹکی لیجیئے!" مدحت زہرہ نے کہا "مجھے یقین نہیں کہ آپ میرے پاس ہیں، میرے اللہ! کیا میں ہوش میں ہوں؟"

"تم ہوش میں ہو، مگر اب میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔" جج صاحب نے کہا "تم برسوں سے یہیں اور مجھے پتہ نہیں، آج اگر تمہاری سوء مزاجی سے گھبرا کے ناجیہ مجھے بلا نہ لاتی تو کبھی پتہ نہ چلتا اپنی موجودگی کی اطلاع نہ دی، سزا دی رہی تھیں مجھے!"

"نہیں!" مدحت بولیں "میں تو خود ہی سزا جھیل رہی تھی، مگر ناجیہ، میری پیاری بچی، وہ کیسے پہنچ گئی آپ کے پاس، وہ آپ کو کیا جانے اور اب ناجیہ کہاں ہے ابھی تو تھی یہاں، میرے پاس۔"

"مدحت ذرا تو خود کو سنبھالو، ہوش میں آؤ" جج صاحب نے پھر ان کے بازو تھام لئے۔ "ناجیہ میری بچی ہے، وہی تو مجھے یہاں لائی تھی، وہ ڈاکٹر کو لے کر آتی ہو گی، کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔"

"آپکی بیٹی ہے" وہ ایک نشے کے سے عالم میں بولیں "تبھی تو، اب معلوم ہوا، دل کے رشتے خون کے رشتوں سے خوبصورت ہوتے ہیں، آپکی بیٹی ہے نا، اسی لئے مجھ سے اتنی محبت ہے"۔ دفعتہً کمرے سے باہر ناجیہ نے کہا "ڈاکٹر صاحب آ گئے ڈیڈی، بھیجوں وہاں؟" وہ باہر ہی رہ گئی اور ڈاکٹر صاحب کو اندر بھیج دیا۔ جج صاحب نے خود کو سنبھالا اور اپنا چہرہ غیر جذباتی بنا لیا تھا، ڈاکٹر سکینہ نے مدحت زہرہ کو دیکھا بھالا پھر بولے۔

"نمونیے کا شدید اثر ہے، آپ ان کو نرسنگ ہوم میں فوری داخل کر دیجیئے، ایمرجنسی ٹریٹمنٹ سے ممکن ہے حالت سدھر جائے، گھر پر علاج ممکن نہیں ہے۔"

"تو کیا ابھی لے چلوں؟" جج صاحب نے کہا

"مناسب تو یہی ہے!" سکینہ صاحب بولے۔

کیا تکمیل نقشِ ناتمام شوق کی خاطر
جو تم سے ہو سکا تم نے جو ہم سے ہو سکا ہم نے

ناجیہ کو اسپتال میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ دہلی ڈاکٹروں نے رخصت کا عندیہ شروع کر دیا تھا، وہ بادلِ ناخواستہ گھر آئی اور ایک جسم بے روح کی مانند گھر میں بیٹھی۔ آج اسے ایک عجیب سوگواری نظر آ رہی تھی، آسمان کا دل تو شام ہی سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک صبر کر لیا۔ رات کے کسی حصے میں آنسو بہانے لگا۔

ساری رات ناجیہ اندیشناک خیالوں میں گھری رہی۔ صبح اس سے رہا نہ گیا۔ عدنان کے گھر سے پتہ چلا تھا کہ وہ درعفان دو تین روز کیلئے آ رہے تھے۔ بیگم ان کے استقبال کی تیاری میں لگی تھیں اتنی مصروف تھیں کہ ناجیہ سویرے ہی اسپتال چلی۔ ساری رات جب وہ باہر گھر نہ آئے وہ اکثر دوستوں کے پاس رہ جاتے تھے، لہذا بیگم کو تشویش نہ تھی مگر ناجیہ نے باہر جانے کی اجازت لی۔ انھوں نے کہا

"اب تو تمہارے ڈگری ہے باہر بھی جاتی ہو، خدا اس بچے تک آتی ہوگی اسے تم آج دیکھو کیا کہیں گے دونوں میاں بیوی؟"

"ابھی تو دور ہیں گے امی" ناجیہ بولی "میں ابھی آجاؤں گی!"

"آخر جا کہاں رہی ہو" انھوں نے پوچھا مگر ڈرتے ڈرتے۔ کیونکہ اس کی دھمکی بیگم کو ہر وقت یاد رہتی تھی۔

"میری باجی جان بیمار ہیں انھیں دیکھنے کے لئے آؤں گی" ناجیہ بولی

"وہ ہم سائے والی؟"

"جی؟"

ناجیہ نے راستے سے بہت پھل خریدے ایک گلدستہ لیا اور نرسنگ ہوم پہنچی۔ راستے بھر دعائیں مانگتی گئی کہ وہ انھیں صحت مند دیکھے۔ اوپر پہنچی تو اس کا دل دھڑک دھڑک کے اسے پریشان کرنے لگا۔ ایک ڈاکٹر پچھلی شام جس نے مدحت کو بچایا تھا ادھر سے گزرا۔ ناجیہ نے اس سے انکی خیریت پوچھی۔

"جی ہاں! ہوش آگیا ہے"، وہ مہذب انداز میں بولا۔

"ہوش آگیا —" ناجیہ خوش ہو کر بولی۔

اس کا وارڈ سامنے تھا۔ ناجیہ نے قدم آگے بڑھائے مگر اندر سے آنے والی آواز کو سن کر وہ ٹھٹکی، آواز اس نے پہچان لی تھی، وہ خوش ہوئی اور دعائیں زرہی ہیں، دوسری بھاری اور دلگداز آواز سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے لگی، ہزاروں میں جج صاحب کی دلکش آواز وہ پہچان سکتی تھی، وہ سوچنے لگی، بہت ہی ہمدرد اور نیک دل ہیں میرے ڈیڈی، کسی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتے، شاید ساری رات ان کے پاس رہے۔

"میں آج پھر سے زندہ ہوا ہوں مدحت!"، وہ کہہ رہے تھے "کتنا محروم تھا میں، تم ایک دیوار کے پیچھے تھیں اور مجھے علم نہ تھا، سچ مانو مدحت، تم کو بستر پر جب بے ہوش دیکھا تو یقین نہیں آیا، حیران ہوں کہ بے ہوش خود میں کیوں نہ ہو گیا، پچیس سال کے بعد میرے خدا!"

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا"، اس نے مدحت کی کمزور آواز سنی "سچ مانیے کہ ایسے خواب ہمیشہ دیکھتی رہی۔ آپ تو مجھ سے برسہا برس پہلے جدا کر دیے گئے تھے۔"

"مدحت! بہت کچھ ہے کہنے کیلئے" جج صاحب بولے "اپنی کہانی، تمہارا افسانہ، اسے خواب نہ سمجھو، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں، کتنے سہانے اور خوش رنگ وعدے کئے تھے میں نے تم سے جو وفا نہ کرسکا، میں بھولا نہیں ہوں مدحت! میں خوش حال ہوں مگر میں ہی کہتا ہوں تو خود کو دنیا کا بدنصیب ترین آدمی سمجھتا ہوں جسکے ہاتھ سے دنیا نے جامِ شیریں چھین لیا اور زہر کا پیالہ تھما دیا، میں اس بے مقصد زندگی میں گذار رہا ہوں شاید ان آنسوؤں کا حساب نہ دے سکوں گا۔"

"میں آپ سے حساب کہاں لیتی ہوں" مدحت نے کہا "کیا مجھے تقدیر کی بے مہری اور دنیا کی سنگدلی معلوم نہیں، آپ اپنا دل برا کیوں کر رہے ہیں، آپ کو ہر فکر سے بے پروا ہو کے اپنے گھر بار اور بیوی بچوں میں ——"

"وہ سب خوش ہیں" جج صاحب نے کہا "مجھے تو بس تمہاری فکر ہے، میں تم سے شرمندہ ہوں، مدحت میں رہا تمہارا مصطفےٰ ہوں جس کے زمانے نے تم کو عرش پر پہنچا دیا تھا مگر جب تم نیچے آئیں تو میں تم کو سنبھال نہ پایا، میں نے خاندان سے کنارہ کشی کیوں نہ کرلی، ایک ناپسندیدہ بوجھ سر پہ کیوں لا دلیا، مدحت مجھے زندگی نے حقیقی خوشی سے دور رکھا، کچھ دے مجھ پر حاوی رہے جن سے میں کبھی نجات نہ پا سکا۔"

"جج صاحب آپکی ساری باتیں سچ ہیں" مدحت نے کہا "مگر آپ ہی بتایئے اب میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں، آپ مجھے نہ ملے تھے، میں صبر کر چکی تھی، خدارا اب رہی سہی سکون سے گذار نے دیجئے، میں آپ کو بھول جاؤنگی، آپ مجھے بھول جایئے!"

"نہ کبھی میں بھولا تھا نہ بھول سکونگا" جج صاحب نے کہا "میں نے تو اب ایک عزم کرلیا ہے کہ تمہاری زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کردونگا، میں تمہارے آنسوؤں کو تبسم میں بدل دوں گا، کیونکہ تمہارے ساتھ خود کو بھی خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جج صاحب! اب میں آپ سے کچھ بھی نہیں چاہتی" وہ بولیں "اگر آپکو میری خاطر منظور ہے تو اس ناگہانی ملاقات کو بھول جائیے، آپ اتنا نہیں سوچتے کہ ایک پرسکون گھر ہے بیوی بچے ہیں، میں نہیں چاہتی کہ انصاف بانٹنے والا ان سے بے انصافی کرے، اور پھر نا جیہ وہ آپکو بہت چاہتی ہے اُسے کوئی دکھ نہ دیجئے، آپ خدارا یہاں سے جائیے"

"تو تم مجھے آخری موقع بھی نہیں دینا چاہتیں؟"

"کس بات کا موقع؟"

"اپنی ساری کوتاہیوں کی تلافی کا موقع"

"وقت گذر چکا ہے جج صاحب!"

"تم چاہو تو وقت پھر واپس آسکتا ہے۔"

"زندگی عزیز کے ۲۵ برس گذر چکے" وہ ہنس پڑیں، "کیا آپ واپس کر سکتے ہیں میرے جذبات، وہ دلکشی، وہ ماحول وہ فضا یہ سب مجھے دے سکتے ہیں؟"

"ہاں! میں سب کچھ دے سکتا ہوں" جج صاحب بولے" عمر رفتہ، گذشتہ برس نئے جذبات، تم میرا ساتھ دینے پر راضی تو ہو جاؤ!"

"تو پھر کیا کریں گے آپ؟"

"میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں" جج صاحب بولے "تھوڑی سی جوانی رہ گئی ہے وہ میں ساتھ ساتھ گذارنا چاہتا ہوں"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" مدحت نے کہا "کیا میری نیک نامی کو داغدار کریں گے؟"

"جائز خواہشوں کی بجا آوری کرنا نیک نامی پر داغ لگانا نہیں ہے۔"

"مان جائیے جج صاحب خدا کیلئے مان جائیے" وہ گھگھیائیں "میں اب کچھ بھی نہیں چاہتی۔ بس اتبا کے پرانے گھر میں چلی جاؤنگی، آپکے پڑوس میں نہیں رہونگی۔"

"کیا میں وہاں نہیں پہونچ سکتا"

"کیا کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"بس دیکھ لینا!"

"اس سے تو موت کہیں اچھی ہے!"

"واہ محبت واہ!" جج صاحب نے کہا "اتنی سنگدل بن گئی ہو تم۔ میں تم کو زندگی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں اور تم موت کی طلب گار ہو۔"

پھر کرسی کھسکانے کی آواز آئی اور پردہ ایک طرف سرکا، جج صاحب باہر نکل کے کسی طرف دیکھے بغیر چلے گئے، ناجیہ دم بخود کچھ دیر کھڑی رہی، پھر خود کو سنبھال کر اندر گئی، وہ سوچ رہی تھی کیا دیکھے گی اندر، ایک شگفتہ صحت مند چہرہ یا ناکام و نامراد صورت۔ اب اس کیلئے باپ کی اداسی اور اپنی باجی کی المناک حیرت حیات کا راز، راز نہ تھا وہ حیران تھی کہ ان دونوں کا انجام کیا ہوگا۔ دونوں اپنی ضد پر قائم۔ کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ جج صاحب ان سے نکاح کر لیتے، ناجیہ کی عقل گم تھی۔

اُسے کمرے میں قدم رکھتے دیکھ کر وہ مسکرائیں، ناجیہ سہم گئی۔ ان کا چہرہ سفید اور بے رونق ہو رہا تھا جیسے کسی نے جسم کا سارا خون نکال لیا ہو۔"

"کیسی ہو باجی؟" وہ ان کے پاس جا بیٹھی۔ جواب دئے بغیر وہ ایک انگوٹھی انگلی میں گھمانے لگیں۔ ناجیہ نے پہچان لیا وہ انگوٹھی جج صاحب کی تھی جسے وہ پہنے رہتے تھے اور اب اتار دے گئے تھے۔

"کبھی کبھی۔ دعا دینے والے دوا بھی دینے میں ناجو! میں بالکل اچھی ہوں" وہ مسکرائیں "پریشان مت ہو میں کل تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔"

"ہاں باجی! جلدی سے اچھی ہو کر گھر چلیے۔"

"ہاں، چلوں گی ناجو!" انھوں نے کہا "سنو وہ میرے تکیے سے تم نے چند خط جو بھیجے تھے وہ وہیں رکھے ہیں یا کہ تم نے اٹھا کے ... کی میز پر رکھ دئے تھے؟"

"خیال نہیں رہا باجی!" وہ شرمندہ سی بولی "یہاں سے میں آپکے گھر جا، بکی اور وہ سارے خط الماری میں رکھ دونگی، آپ اطمینان رکھیے میں انکو پڑھونگی نہیں۔"

"ناجو!"

"جی!"

"وہ خط مجھے جان سے عزیز ہیں، میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ میرے ساتھ ہی وہ میری قبر میں رکھ دئیے جائیں۔"

"توبہ توبہ باجی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" وہ خائف ہو کر بولی۔

"بس یوں ہی ایک بات یاد آئی تم سے کہدی" وہ بولیں "یاد رکھنا، آدمی کو ایک دن جانا ہے میری ناجو! ہمیشہ کے لئے کوئی نہیں آیا۔"

"آپ ابھی بہت جیئں گی باجی! پچاس سال اور" اس نے صدق دل سے کہا "صبح صبح میرا جی چاہنے لگا تھا ناجو کہ میں تحفے کے طور پر وہ گھر جس کے باغ تم کو پسند ہیں تمھیں دیدوں، ایک سادہ کاغذ پر اس کی ملکیت میں نے تمہارے نام کر دی ہے۔" انھوں نے بڑے پیار سے کہا پھر ہنس پڑیں "اب تم مالک مکان ہو تم کرایہ دار بن کے رہونگی۔"

"خدانخواستہ!" ناجیہ مذاق سمجھی، اپنی طرف بڑھایا ہوا ایک کاغذ جس پر جانے کیا لکھا تھا، اس نے کمر میں رکھ لیا اور خود بھی چھوٹا سا قہقہہ لگا کے بولی:۔

"اب دیکھیے گا اتنے بڑے گھر کا کرایہ ہزاروں روپے لوں گی، اگر کچھ پھول پھل مانگیں گی تو ان کی قیمت الگ دینی پڑے گی۔"

"اچھا اچھا!" وہ ہنس دیں اور وہ انگوٹھی جو انکی نازک سی انگلی میں فٹ نہ تھی، گریبان میں رکھ لی ناجیہ نے انھیں پھل کھلائے، تھرماس سے انکی پسندیدہ کافی پلائی پھر وہ لیٹ گئی تھیں ناجیہ ان کو گھر کی باتیں بتاتی رہی، عذرا کے جرمنی جانے کا ذکر کیا دیر پھر

شہزاد نے قہقہہ لگا کے رفیع کا واقعہ سنایا کہ معلوم نہیں وہ کالج کو خیر باد کہہ کے کہاں چل دیا تھا، بڑا فرہاد کا بچہ بنا پھرتا تھا۔"

"زندگی کے کسی موڑ پر ضرور ملے گا۔" انھوں نے کہا "ایسا حادثہ اکثر ہوتا ہے، اور باسم کو میرا وہ گھر یاد ہے جس میں ہوٹل ہے ایک دفعہ ہم نے وہاں لنچ کیا تھا۔"

"جی ہاں!" وہ بولی "مگر کیوں؟"

"... پسند ہے نا وہ؟"

"بہت پسند ہے!"

"میں بیمار ہوں، کرایہ وصول کرنے جا نہیں سکتی، ایک خط لکھ دوں گی تم کرایہ لے آیا کرنا۔"

ناجیہ نے سوچے سمجھے بغیر وعدہ کر لیا۔ پھر انھوں نے کہا

"میرے پاس بیسے خرچ ہو جاتے ہیں، تم جمع کرتی جانا جب ضرورت پڑے تو دیدینا"

"بہت اچھا باجی!"

"میں بہت تھک گئی ہوں ناجو، کچھ دیر سو رہوں۔"

"ضرور باجی ضرور!" وہ بولی "آپ آرام کیجیے میں آپ کا سر دبا دوں۔"

"نہیں میری ناجو! میرے سر میں درد نہیں ہے۔"

ناجیہ کے دل میں ایک انار سا چھوٹ رہا تھا۔ وہ رہ رہ کے یہ سوال لبوں تک لے رہ جاتا کہ آنچ لینے پڑنے نجمہ سے مل کے کیا محسوس کیا تھا، ناجیہ نے ایک پل تیسے رکھی۔ سوچ رہ ڈیڈی جب ایک دوسرے کے ہو جائیں گے تو اس کی ماں کا کیا ہوگا، وہ اسی سوچ کے شادئ مرگ کی کیفیت میں تھی کہ آخر کار دو چاہنے والے بعد مدت کے مل گئے۔ وہ شام بہت ویران تھی، ایسا ویران موسم تھا کہ ناجیہ کا دل سینے میں گھبرا رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ بادل پھٹ جائیں اور سورج نکل آئے۔ وہ دلگیر سی اپنے برآمدے میں کھڑی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ جج صاحب پر پڑی وہ

[illegible] ناجیہ دوڑ کے ان کے پاس پہنچی۔

"کیا بات ہے ڈیڈی؟" وہ گھبرا گئی۔ جج صاحب نے اُسے اس طرح دیکھا کہ جیسے انھیں کچھ نظر نہ آرہا ہو۔

"ناجیہ! سب کچھ ختم ہوگیا" وہ دل تھام کے بولے، "تمھاری باجی نے زہر کھا لیا، جگر کٹ گیا ان کا اور ان کا وجود خون بن کے بہہ گیا" وہ بیٹھ گئے۔

"نہیں ڈیڈی ایسا نہیں ہوسکتا" وہ چیخ کے بولی "میں دس بجے تک ان کے ساتھ تھی، آپ نے کس سے سنا ہے ڈیڈی، یہ سب غلط ہے ڈیڈی!"

"خبر غلط نہیں ہے ناجیہ! ابھی ابھی ڈاکٹر سکینہ نے فون پر اطلاع دی ہے آہ میرے خدا، یہ کیا ہوا، میں کیوں ملا تھا ان سے، کیوں ملا تھا"

جج صاحب ضبط نہ کرسکے، بچوں کی طرح رونے لگے اور ناجیہ اسی جگہ گر کے بے ہوش ہوگئی۔

محبت کی ایک کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

جج صاحب محرومِ الفت تھے وہ یہ صدمہ سہہ نہ سکے، انھیں ایک چپ سی جو لگی تھی کاروبارِ دنیا سے ان کا دل سرد ہوگیا تھا، کسی بات سے دلچسپی نہ رہ گئی تھی، ان کی غمخوار راز دار صرف ناجیہ تھی، دونوں کے غم ایک تھے اب وہ دونوں بس نیم کے نیچے مرنے والی ہی کی باتیں کرتے تھے، ناجیہ کے آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹتا تھا جج صاحب کو ایک ہی غم کھائے جارہا تھا وہ اپنی ہیرے کی انگوٹھی مدحت کو دے آئے تھے، ہر وقت وہ کہتے رہتے تھے،

"کیوں دی تھی ان کو ہیرے کی انگوٹھی، میں کیوں ملا تھا ان سے، چپکے ہی چپکے زہرِ غم پی رہا تھا اور ایک دن دنیا سے چلا جاتا، میں نے ایک ساکن دریا کی سطح پر پتھر کیوں پھینکا تھا"

پھر وہ بچوں کی طرح خود کو بہلاتے،

"ناجیہ! میں سچ مچ ان کے غم دور کرنا چاہتا تھا، میرا مطلب یہ نہ تھا۔ مگر وہ ڈر گئی تھیں، دنیا والوں سے اسی لئے تو اپنے خون میں ڈوب گئیں، کتنا خون تھا، کتنا خون تھا، اف،"

ناجیہ ان کو بہلاتی، تسلیاں دیتی، مگر نہ بہلنے ان کے دل پر کیسا گہرا اثر ہوا تھا، پھر وہ سنبھل نہ سکے، ایک رات اس طرح سوئے کہ پھر نہ جاگے، ناجیہ نے مدثت کی وصیت کے مطابق ان کے خدا پڑھے بغیر ان کے ساتھ دفن کروا دیئے اور ان کے گھر میں منتقل ہو گئی، اسما نے کسی کی نہ سنی، اپنی خودکشی کی دھمکی سے بیگم سلمٰی کا منہ وہ بند کر ہی چکی تھی، شوہر کے مرنے کے بعد دل شکستہ ہو کر وہ عذرا کے پاس جرمنی چلی گئیں،

یک زمانہ بیت گیا تھا

اور اب ایک سن رسیدہ خاتون کے روپ میں ناجیہ مصطفٰے اپنی خالہ اماں کے ساتھ ان کے ہی گھر میں پہروں نیم تلے بیٹھی پچھلے دنوں کی دل خراش یادوں میں گم رہتی، پچھلے دن جو اچھے ہوں سے بار بار یاد آتے ہیں، مگر پھر کبھی واپس نہیں آتے!

ختم شد

شکیبہ بلگرامی

کے
موسم
کے
گلاب